پندرہ روزہ

چنگاری

دہلی

اشاعتی دُنیا میں
ایک معتبر نام

تاج کمپنی

- تاج کمپنی کی مطبوعات معیاری اور مثالی ہوتی ہیں۔
- تاج کمپنی جدید طباعتی طریقوں کے ذریعے فوٹو آفسٹ پروسس سے کتابیں شائع کرتی ہے۔
- تاج کمپنی کے شائع کردہ قرآن مجید اور حمائل شریف بے حد دیدہ زیب طباعتی خوبیوں سے مزین، سفید دبیز کاغذ پر دستیاب ہیں۔
- تاج کمپنی نے اسلام اور اسلامیات سے متعلق معروف مصنفین کی معلوماتی کتب کے انگریزی اور اُردو میں مجلد ایڈیشن شائع کئے ہیں۔
- تاج کمپنی کا ایک وسیع اشاعتی پروگرام ہے جس کے ذریعے معتبر و مستند اسلامی لٹریچر، بہترین طباعت و اشاعت کے ساتھ انگریزی اور اُردو میں پیش کیا جائے گا۔
- تاج کمپنی کی مطبوعات یقیناً آپ کی زندگی کی اہم ساتھی ہوں گی۔

تاج کمپنی کی کتابیں مطالعے کے لئے معیاری اور تحفے کے لئے مثالی رہیں گی۔
مستند مواد، معیاری طباعت، مناسب نرخ، یہ ہے تاج کمپنی کی انفرادیت!

اب تک شائع ہونے والی مطبوعات درجِ ذیل ہیں:

۱۔ قرآن مجید، نمبر ۲۲ ترجمہ: علامہ احمد رضا خاں صاحب بریلوی، تفسیر: مولوی محمد نعیم الدین — ہدیہ -/۱۲۵ روپے
۲۔ قرآن مجید (عربی۔ اردو۔ انگریزی) انگریزی ترجمہ: مرماڈیوک پکتھال، اُردو ترجمہ: مولانا فتح محمد جالندھری — ہدیہ -/۹۰ روپے
۳۔ قرآن مجید، دی گلوریس قرآن (عربی متن اور انگریزی ترجمہ): مرماڈیوک پکتھال — ہدیہ -/۲۸ روپے
۴۔ تاج بہشتی زیور، کامل اصلی ———— مولانا اشرف علی تھانوی — ہدیہ -/۶۰ روپے
۵۔ مجموعۂ وظائف مترجم ———— (دو رنگوں میں) — ہدیہ -/۱۵ روپے
۶۔ بائبل، قرآن اور سائنس ———— مورِیس بوکائیے —— (پیپر بیک) — قیمت -/۲۵ روپے
۷۔ بائبل، قرآن اور سائنس ———— مورِیس بوکائیے —— (مجلّد) — قیمت -/۳۰ روپے
۸۔ نوائے مشرق ———— علامہ اقبالؔ اور مولانا مودودی کا ایک تقابلی مطالعہ: سعید احمد — قیمت -/۳۰ روپے
۹۔ فیروز اللغات ———— اُردو جیبی ———— (طلبا کے لئے) — قیمت -/۱۲ روپے
۱۰۔ فیروز اللغات ———— اُردو ———— (بڑے عام سائز میں) — قیمت -/۲۵ روپے

THE QURAN READER	by S. Mohammad Tufail	15.00
ALLAH OUR CREATOR	by Mohd. Zia Ullah	18.00
CREATION OF A MAN	by Kausar Niazi	12.00
CORRESPONDENCE BETWEEN MAULANA MAUDOODI & MARYAM JAMEELAH		12.00
MIRACLES OF THE PROPHET MUHAMMAD	by M. A. Qazi	11.00
MORALITY	by Dr. M. Muslehuddin	11.00
PROPHET MUHAMMAD'S GUIDANCE FOR CHILDREN	by Abdur Rauf	P. B. 12.00 H. B. 15.00
WESTERNIZATION AND HUMAN WELFARE	by Maryam Jameelah	12.00
THE TAWASIN	by Hussain Bin Mansur	10.00
DUTIES OF AN IMAM	by A. R. Shad	8.00
ISLAM AND THEOCRACY	by M. M. Siddiqi	8.00
THE SUNNAH	by Dr. S. M. Yusuf	8.00
WESTERNIZATION VERSUS MUSLIMS	by Maryam Jameelah	7.00
ISLAM AND THE MUSLIM WOMAN TODAY	by Maryam Jameelah	6.00
MORDERN TECHNOLOGY AND THE DEHUMANIZATION OF MAN	by Maryam Jameelah	4.00
THE MYSTRIES OF FASTING	by Nabih Amin Faris	5.00
IS WESTERN CIVILIZATION UNIVERSAL	by Maryam Jameelah	4.00
THREE GREAT ISLAMIC MOVEMENTS IN THE ARAB WORLD OF THE RECENT PAST	by Maryam Jameelah	4.00
THE KASHF AL MAHJUB	by Ali Bin Uthman Tr. by R. A. Nicholson	65.00
THE HOLY QURAN (Arabic text with English and Urdu translations)	by M. M. Pickthall and Maulana Fateh Mohd. Jallandhri	80.00
DAWAT-UL-QURAN	by Dr. Fazluddin Ageeri	60.00
ISLAM VERSUS AHL AL KITAB	by Maryam Jameelah	40.00
ISLAM & THE REMAKING OF HUMANITY	by A. H. Siddiqi	45.00
ISLAM THE IDEAL RELIGION	by Prof. S. Y. El-Digwy	40.00
MUSLIM ETIQUETTES	by A. R. Shad	40.00
UMM AL MUMININ AISHAH SIDDIQAH	by Mumtaz Moin	40.00
PATH TO PARADISE	by Mohd. Imran	35.00
THE MISSION OF ISLAM	by S. M. Iqbal	P. B. 35.00 H. B. 50.00
HAWA-E-MASHRIQ (URDU)	by Saeed Ahmed	30.00
THE MEANING OF THE GLORIOUS QURAN	by M. M. Pickthall	28.00
WIVES OF THE PROPHET	by Fida Hussain Malik	25.00
ISLAM, CHRISTIANITY AND HINDUISM	by F. M. Sandeela	23.00
WOMAN IN ISLAM	by S. A. Saif-Al-Haliany	20.0g
THUS SPOKE THE HOLY PROPHET	by Bennett and Browne	20.00
BAHISHTI ZEYAR (Urdu)	by Maulana Ashraf Ali Thanvi	60.00
QURAN FOR CHILDREN	by Abdur Rauf	P. B. 11.00 H. B. 17.00
TWO MUJAHIDIN OF THE RECENT PAST AND THEIR STRUGGLE FOR FREEDOM AGAINST FOREIGN RULE	by Maryam Jameelah	4.00
A GREAT ISLAMIC MOVEMENT IN TURKY	by Maryam Jameelah	3.00
ISLAM AND OUR SOCIAL HABITS	by Maryam Jameelah	3.00
ISLAM AND MODERN MAN	by Maryam Jameelah	3.00
ISLAMIC CULTURE IN THEORY AND PRACTICE	by Maryam Jameelah	3.00
RATIONAL APPROACH TO RELIGION	by Zia-uddin Kirmani	3.00
SHAIKH HASSAN AL BANNA & AL IKHWAN AL MUSLIMUN	by Maryam Jameelah	3.00
THE GENERATION GAP	by Maryam Jameelah	3.00
WHY I EMBRACED ISLAM	by Maryam Jameelah	3.00

پندرہ روزہ

چنگاری دہلی

ایڈیٹر: جمیلہ احمد

ادبی حصے کی ترتیب: بشیر احمد
انیس احمد خاں

شمارہ نمبر — ۱۸

قیمت: ۲ روپے ۔ سالانہ ۴۵ روپے

پتہ: ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

جمیلہ احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے جے۔کے آفسٹ پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی سے شائع کیا۔

اِس شمارے میں

آپ کا خط ملا	قارئین	۲
اداریہ	ادارہ	۳
فٹ نوٹس	ستار طاہر	۵
عاشق روشنی کے (افسانہ)	رشید عارف	۱۳
شہر کا کینسر (افسانہ)	محمد طارق	۱۵
کھنٹی پر ٹنکا ہاتھ (افسانہ)	مشرف عالم ذوقی	۱۷
شادی کا پیغام (ڈرامہ)	چے خف / انوار رضوی	۱۸
کارٹون		۲۷
سخن در سخن (خانہ بگوش)		۲۹
کتابوں کی باتیں (تبصرے)	ب - ا	۳۳
غزلیں:		
فضا ابن فیضی		۳۶
خورشید سحر		۳۷
نیاز اعظمی		۳۸
وہاب تسنیم - فاروق صدیقی، دیویندر گوتم		۳۹
نظمیں:		
دوسرا رُخ	حمید الیاس	۳۷
ترش و تلخ - ضیا جبلپوری		۳۹
فریاد کی لے - یعقوب عامر		۴۰
فتح - مختار شمیم - سانپوں کا شہر، بیروت میں - امیر عارفی		۴۱
میرا گھر - تشویش	اختر نظمی	۴۲

آپ کا خط ملا

راجندر سنگھ بیدی نمبر اور لوکاچ پر اصغر علی انجینئر کی کتاب اور سعادت حسن منٹو پر کتاب بھیج دو۔ لیکن وی۔ پی کتنے روپے کی ہوگی، ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر ڈال دو تو وی پی سے پہلے آجائے گا۔ وی پی چھڑانے میں آسانی ہوگی۔

'چنگاری' نہیں آرہا ہے۔ سوچ رہا تھا کہیں شعلہ نہ بن گیا ہو۔

"چنگاری" کے لیے کیا لکھوں؟ ویسے بھی ہوئی چیزیں حیات یا کمیونسٹ جانگوں میں چھپ جاتی ہیں۔ اور پھر ان سیاسی مضامین کو کون چھاپے؟

راج بہادر گوڑ۔ حیدر آباد

• • •

آپ مجھے اپنے موقر رسالہ "چنگاری" کے شمارے برابر بھجوا رہی ہیں۔ اس لطف پروری و قدر افزائی کے لیے شکر گزار ہوں اور اپنی کوتاہ قلمی پر شرمندہ کہ بروقت اس ادبی احسان والتفات کے اعتراف میں آپ کو مخاطب کرنے کی مسرت نہ حاصل کر سکا۔ ادھر علائق و مسائل حیات میں اس قدر الجھ گیا ہوں کہ خواہش و ارادہ کے باوجود ادبی حوالوں اور رشتوں کی خوشگوار ترتیب سے قاصر رہ جاتا ہوں۔ صحت کی مسلسل خرابی بھی واجبات کی ادائیگی میں مانع آرہی ہے۔ بہر حال اپنی اس غفلت اور سستی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

رسالہ مواد کی صحت مندی و بوقلمونی اور اپنے مقررہ معیار کی نفاست و تازگی کے سیاق و سباق میں پسند آیا۔ اسے اچھے اور معتبر لکھنے والوں کا تعاون بھی حاصل۔ آپ اور آپ کے ذہن رفقا اسی ذوق، لگن اور چابکدستی سے اس کی ترتیب و تہذیب کرتے رہے تو ملک کے جریدوں میں یہ بہت جلد اپنی ایک مخصوص جگہ بنالے گا۔

فضا ابن فیضی۔ مئوناتھ بھنجن

• • •

چنگاری کا ایک شمارہ مجھے اس وقت ملا تھا جب میں عارضۂ دل کی وجہ سے فریش تھا اور خط لکھنے سے معذور تھا۔ دوسرا شمارہ کل موصول ہوا ہے سراپا سپاس ہوں۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

پرچہ اچھا ہے آپ نے ادب اور صحافت کا امتزاج بہت ہی سلیقہ مندی سے کیا ہے۔ ایسے پرچے کی کمی تھی، اور شدید ضرورت بھی! آپ نے اس خلا کو پر کرکے لائق تحسین فریضہ انجام دیا ہے۔ کاش آپ کو خاطر خواہ قلمی تعاون ہو سکے۔ تاکہ پاکستانی اخبارات و رسائل سے صرف اسی حد تک اخذ کرنا پڑے جتنا وہاں کی ادبی رفتار کی نمائندگی کے لئے ضروری ہو۔

ابن فرید۔ علی گڑھ۔

• • •

"چنگاری" اکثر نظر سے گزرتا رہتا ہے۔ چنگاری کیا ہے؟ ایک شعلہ جوالہ ہے ایک پھول ہے جو سارے ادبی چمن کو مہکا رہا ہے

چنگاری کے لیے پہلی بار اپنی غیر مطبوعہ غزل بھیج رہا ہوں۔

واصف عابدی۔ سہارنپور

• • •

"چنگاری" کے کچھ شمارے مجھے بھوپال کے پتہ پر ملے تھے اور اب تازہ شمارہ اندور کے پتے پر موصول ہوا ہے حالانکہ "چنگاری پندرہ روزہ ہے لیکن مشمولات کو دیکھ کر ماہنامہ کا گمان گزرتا ہے۔ آپ کا دائرہ کار 'علمی' ادبی اور سیاسی کارگزاریوں پر محیط ہے لیکن علمی و ادبی کالموں کے ساتھ ساتھ سیاسی تحریریں بھی جاندار ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ آپ نے حقیقت پسندی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔

نواب امیر خاں انجام سے متعلق مضمون پڑھ کر معلومات میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ "آنندی" کے مصنف غلام عباس سے لیا گیا انٹرویو بھی دلچسپ ہے۔ مرحوم غلام عباس کی کچھ باتیں تو بڑے کام کی ہیں۔

ممتاز شمیم۔ اندور

• • •

سلام مسنون! آپ کا کارڈ موصول ہوا اس میں آپ نے 'چنگاری' کی ترسیل کے بارے میں تحریر فرمایا ہے لیکن عرض یہ ہے کہ "چنگاری" مجھے آج تک موصول نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ کہیں راستے میں گم ہوگیا ہے۔ بیحد افسوس ہے کہ میں اس کے مطالعہ سے محروم رہا۔ آپ نے جو کچھ پرچے میں لکھا ہے اس سے اس کے معیار کی جھلک واضح ہے۔ میں ہر قسم کے تعاون کے لئے حاضر ہوں۔ براہ کرم پرچہ دوبارہ بھیجئے تاکہ اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہوں۔ کچھ عرصہ بعد 'دہلی' میں انڈو پاک شاعرہ ہو رہا ہے جس میں حاضر ہوں گا۔ چنگاری کا چندہ بھی میں ادا کر دوں گا کیونکہ میں ادب کو بہر حال پروان چڑھتے دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ چنگاری کے لیے دو غزلیں بھیج رہا ہوں۔

جعفر شیرازی۔ پاکستان

• • •

آپ کے پرچے کا پہلا شمارہ جو میں نے دیکھا اس کے باہر خواجہ احمد عباس اور بیگم عباس کی تصویر تھی۔ یہ مجھے اتنا پسند آیا کہ میں اگلے دو شمارے کا انتظار کرنے لگا اگلے دو شمارے بھی بہت پسند آئے۔ ان سے اگلا شمارہ جب کئی دن تک کناٹ پلیس میں مسجد کے سامنے والی دکان پر نہیں دیکھا اور پوچھنے پر کچھ پتہ نہیں چلا تو عصری بک سنٹر ۲/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ سے پتہ کرنا چاہا۔ بہت کوشش کے باوجود میں یہ جگہ ڈھونڈ نہیں پایا جس کسی سے پوچھا اس نے کہا کہ یہ کوئی پرانا نمبر ہے اب نمبر بدل گئے ہیں۔ میں مایوس ہوگیا۔ ایک دن اردو گھر میں ایک دوست سے ذکر کیا اور پوچھا کہ کیا چنگاری نام کا رسالہ بند ہوگیا ہے۔ اس نے بتایا کہ ابھی کچھ دن ہوئے اسے چنگاری کا نیا شمارہ ملا ہے۔ اگلے دن کناٹ پلیس والی دکان سے مجھے سولہواں شمارہ مل گیا کیا آپ بتا سکیں گے کہ مجھے پندرہواں شمارہ کہاں سے مل سکتا ہے؟ آپ کا اگلا شمارہ اور کالم نمبر کب تک ملنے کی امید ہے

بھولا ناتھ۔ دہلی

• • •

ماہنامہ نکھار ادب ایک نادر تحفہ پیش کر رہا ہے۔

رضا نقوی واہی نمبر

صفحات ۲۰۰۔ قیمت ۔/۲۰ روپے

• سالانہ خریداروں کو یہ نمبر صرف ۔/۱۰ روپے میں

• صرف ۔/۲۵ روپے ارسال فرماکر سالانہ خریداری قبول فرمائیں۔

نکھار پبلیکیشنز، مئوناتھ بھنجن (یوپی)

اداریہ (۱)

چنگاری، اپنی زندگی کے نئے دور میں آفسٹ کے ۴۴۲ صفحات (سائز ۲۰×۳۰/۸) قارئین کی خدمت میں پیش کر چکا ہے —— کالم نگار نمبر کے لئے ۱۸×۲۲/۸ کے ۶۰۰ سے زیادہ صفحات کی کتابت ہو چکی ہے۔

یہ نمبر کئی اعتبار سے یادگار اہمیت کا حامل ہوگا۔ ابھی تک لوگ کالم نگاری اور اخبار نویسی میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ حالانکہ بعض کالموں نے بڑی شہرت حاصل کی مثلاً رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد، قاضی عبدالغفار کا لیلیٰ کے خطوط اور ادھر فکر تونسوی کا پیاز کے چھلکے۔

کالم نگاروں میں ہمارے جن جیّد ادیبوں کے نام آتے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں • ریاض خیر آبادی • عبدالماجد دریا آبادی •… چراغ حسن حسرت • عبدالمجید سالک • احمد ندیم قاسمی • خواجہ حسن نظامی • قاضی عبدالغفار • رتن ناتھ سرشار • سعادت حسن منٹو • ملا رموزی • حاجی لق لق • شوکت تھانوی • تخلص بھوپالی • ابراہیم جلیس • خواجہ احمد عبّاس • عطاء الحق قاسمی • مجتبیٰ حسین • گور کھا • احمد جمال پاشا • کنہیا لال کپور • نصر اللہ خاں • منو بھائی • ابن انشا۔ اور فکر تونسوی۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ان بلند پایہ فن کاروں کی تخلیقات جب کتابی صورت میں چھپتی ہیں یا ادبی رسائل میں شائع ہوتی ہیں تو انھیں قابلِ قدر ادب پارہ قرار دیا جاتا ہے لیکن جب یہی تخلیقات ہفت روزہ یا روزنامہ میں شائع ہوتی ہیں تو ناقابلِ اعتنا کیوں ٹھہرتی ہیں۔ بات محض تعصبات کی ہے۔ آزادی کے بعد بھی اردو والوں کا مزاج سیاست آشنا نہیں ہوا۔ حالانکہ اب سیاست ہماری زندگی کے بنانے اور بگاڑنے میں اہم رول ادا کرتی ہے اور خود ہم اپنی تقدیر اس وقت تک بہتر ڈھنگ سے سنوار نہیں سکتے جب تک سیاست کے کوچوں سے اچھّی طرح واقف نہ ہوں۔ عام لوگوں کی بات تو جانے دیجئے۔ اہلِ دانش بھی سیاست سے الگ تھلگ رہنے کو دانش مندی سمجھتے ہیں اور ان کی اس غلط فہمی کو جدید ادب کے مشتہرین نے اور بڑھاوا دیا ہے۔ بہر کیف اچھّی ادبی تخلیقات چاہے کہیں چھپیں ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ یہی حال اچھّے کالموں کا ہے مگر بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ کالم نگاری بھی ایک فن ہے یہ بھی ایک ادبی صنف ہے۔ جس طرح زمانے کی گردش کسی ادب پارے کو غیر اہم نہیں بنا سکتی اسی طرح اچھے کالم بھی حیاتِ جاوداں رکھتے ہیں۔ اس کالم نگار نمبر میں آپ دیکھیں گے کہ بعض کالم آج سے سو سے بھی زیادہ برس پُرانے ہیں مگر ابھی تک فرسودہ نہیں ہوئے وہ آج بھی شاداب ہیں اور قارئین کے قیمتی و نادر تجربات میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔ اور ان کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ تجربے آج بھی چراغِ راہ ہیں۔ برسہا برس کے بعد بھی مردہ نہیں ہوئے۔

اس کے علاوہ ان کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ خاص طور پر زبان، ادب، سیاست سماجیات اور تاریخ کے طالب علموں کے لئے ان کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ یہ کالم اپنے زمانے کے اہم واقعات کے عکاس بھی ہیں اور ان واقعات پر اس دور کے تبصرے بھی۔ ان کالموں کے ذریعے نہ صرف ایک ادیب اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے بلکہ اپنے دور کے عوام کے ذہن و جذبے کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔

ان کالموں کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ شروع سے آخر تک قارئین کو لفظوں اور جملوں کے سحر میں گرفتار رکھتے ہیں۔

بہت سے لوگ کالم اور اداریوں میں بھی امتیاز نہیں کرتے حالانکہ ان دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ اداریہ اخبار کی پالیسی کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ مصلحتوں اور مجبوریوں کا اسیر ہو سکتا ہے مگر کالم نگار کے لئے یہ ضروری نہیں۔

اداریہ اخبار کی زبان ہوتا ہے۔ کسی کی شخصیت کی عکاسی نہیں کرتا اس میں داخل سے زیادہ خارج کا موضوع سے زیادہ معروض کا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اداریہ کبھی ایڈیٹر لکھتا ہے کبھی سب ایڈیٹر کبھی کوئی اور ایڈیٹر مگر بکڑا ہمیشہ ایڈیٹر ہی

جاتا ہے جب کہ پیاز کے چھلکے صرف فکر تونسوی لکھ سکتا ہے اور گریباں صرف منٹو بھائی۔

بہر کیف کالم نگار نمبر جلد ہی پیش کر دیا جائے گا اس کی قیمت ..۱ روپئے ہے۔ اور فکر تونسوی نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس میں ۴۰ ادیبوں کی تخلیقات، تصاویر، خاکے شامل ہیں۔ چنگاری کے خریداروں کو غیر معمولی رعایت دی جائے گی۔ ہمارے ادارے سے بیدی نمبر کے بعد یہ دوسرا اہم نمبر ہے۔ اور جلد ہی ایک تیسرا نمبر پیش کیا جائے گا وہ ہے۔

غزل نمبر

اس کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ کتابت جاری ہے۔ اگر آپ غزل کہتے ہیں تو اپنی پانچ غزلیں، تصویر اور بایو ڈاٹا ارسال کیجئے۔ تاکہ غزل نمبر میں شامل کر لیا جائے۔

غزل، اس کی تاریخ، اس کی تنقید، اس کا تجزیہ اور بہترین غزلوں کا انتخاب، اس میں شامل ہوگا۔

(۲)

ابھی تک چنگاری سے جو نقصانات پہنچے ہیں اس کا ذکر فضول ہے۔ اس لئے کہ کون نہیں جانتا کہ شطرنج بازی، کبوتر بازی، پتنگ بازی اور رسالہ بازی سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود لوگ ان بازیوں میں مشغول ہوتے ہیں اس لئے کہ یہ ایک طرح کا سودا ہے۔ ایسا جنوں جو پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بھلا کس نے کہا ہے کہ تم یہ نقصان کا سودا کرو۔ خود بارہا اپنے آپ کو سمجھایا ہے مگر یہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ سر میں ایک اور سودا یہ ہے کہ اس روش پر مت چلو جس پر دوسرے چلتے ہیں اس لئے ۱۵ برسوں سے اپنی الگ راہ نکالنے کی جدّوجہد جاری ہے۔ فائدے دوست اُٹھاتے ہیں نقصان ہم اُٹھاتے ہیں، اس کی شکایت نہیں ہے۔ گلہ صرف ان دوستوں سے ہے جو ہماری پریشانیوں میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں مطلب یہ کہ وہ ایک دو پرچے نہیں لیتے بلکہ اصرار کرتے ہیں کہ کم سے کم چار پرچے تو انھیں دیئے جائیں اور وہ بھی بالکل مفت تاکہ وہ ہماری طرف سے اپنے دوستوں میں تقسیم کر سکیں شائد ان کے خیال میں یہ کوئی شیرینی ہے، لڈو ہے مگر وہ بھی ہمیشہ مفت کہاں ملتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جتنی رقم چنگاری پر خرچ ہوتی ہے اتنی ہی رقم میں ایک فلمی جاسوسی یا کوئی دوسرا سنسنی خیز رسالہ بھی تو چھاپا جا سکتا ہے۔ معمّہ بازی، فرضی دواخانہ، فرضی بڑے یا چھوٹے حکیم صاحب کا کھڑاگ پھیلا کر جنسی امراض اور قوت مردمی کے اشتہارات کے ذریعہ بھی تو روپیہ کمایا جا سکتا ہے۔ مگر طبیعت ادھر نہیں آتی۔ افسوس ہوتا ہے خون کو گرمانے والی، جذبات کو بھڑکانے والی تحریر دیکھ کر۔

بدقسمتی سے ہم جن حالات میں زندگی گزار رہے ہیں وہ بڑے کٹھن ہیں۔ خاص طور پر یوپی اور بہار کے مسلمانوں کے سر پر ہمیشہ تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے ہم درندوں سے بھرے جنگل میں ہیں جب دیواروں پر ایسے نعرے دیکھتے ہیں جن کا مقصد مسلمانوں کو خوف زدہ کرنا اور فرقہ پرست ہندوؤں کو ابھارنا ہوتا ہے تو خوف معلوم ہوتا ہے پتہ نہیں کب کس بات پر فساد ہو جائے اور کب کہاں ہم ہمارے خاندان کے دوسرے افراد قتل ہو جائیں کب ہمارا گھر لُٹ جائے۔ آگ لگا دی جائے۔ اس خوف اس دہشت کو دور کرنے کے لئے حکومت جو کچھ کر رہی ہے وہ ناکافی ہے۔ اور پھر کسی بھی جمہوری ملک میں حکومت تنہا کچھ نہیں کر سکتی اس کے لئے عوام کو آگے آنا پڑتا ہے مگر ابھی تک عوام خاص طور پر اقلیتی عوام مطالبوں سے آگے نہیں بڑھتے۔ خاص طور پر مسلم سرمایہ دار سماجی فلاح وبہبود کے کام میں بہت پیچھے ہیں کتنے اسپتال، کتنے مسافر خانے، کتنے اسکول وکالج، کتنے خیراتی ادارے، کتنے کمیونٹی ہال مسلم سرمایہ داروں نے بنوائے ہیں۔ سری رام آرٹ سینٹر جیسے کتنے سینٹر ہیں۔ نارتھ کے مسلمانوں نے تو بہت کچھ کیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے اپنے پڑوسیوں کو اپنی نیک چلنی اپنے شریفانہ عمل سے اپنا مسحور کر لیا ہے مگر ادھر کے مسلمان خاص طور پر ہندی بیلٹ کے مسلمان کیا کر رہے ہیں۔ یہاں کے سرمایہ دار مسلمان ہوں یا غیر سرمایہ دار ایک ایسے نشے میں مبتلا ہیں جس کی انتہا کا تصور کر کے روح کانپ جاتی ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ کچھ کیا جائے مگر سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے چند مجبوریاں ہیں چند دشواریاں ہیں جو پاؤں کی زنجیر بن گئی ہیں۔ سب سے بڑی دشواری غالباً اپنا ذہن ہے۔ فرقہ وارانہ خطوط پر سوچنا یا کام کرنا آدمیت کو گروہوں میں تقسیم کرنا ہمارے بس سے باہر ہے اس لئے کسی گروہ میں، جماعت میں، پارٹی میں شامل ہو نہیں سکتا۔ دوسری طرف کیسہ میں اتنا زر بھی نہیں کہ کوئی بڑا کام کیا جا سکے۔ اس لئے ہم رسالہ بازی کرتے ہیں اور اپنے کو فریب دیتے ہیں خود کو بہلاتے ہیں کہ صاحب ہم بھی کچھ کر رہے ہیں۔ یہ بھی خیال آتا ہے کہ اتنی بڑی دنیا میں کچھ لوگ تو ہوں گے جو ہماری طرح سوچتے ہوں گے مگر وہ لوگ کہاں ہیں۔ ہمارا قافلہ کب بنے گا۔؟

فی الحال تو یہ شعر ہی دل بہلاتا ہے

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلہ نوبہار ٹھہرے گا

فٹ نوٹس

ستار طاہر

(۱)

کسی کو چاہئے کہ اس شہر کو گردن سے پکڑ لے
اور اسے تھوڑا سا جھنجھوڑ کر رکھ دے

(پولش شاعر زبگنیو ہربرٹ)

ہمارے ہاں بھی ادب کے طالب علم بڑی شدت سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ادب کے شہر میں جو چھوٹی بڑی "کانداریاں اور اجارہ داریاں" قائم ہیں۔ ان کا کچھ محاسبہ کیا جائے۔ مردہ اور بے جان تحریروں کو عظیم اور بے مثل قرار دینے والوں کی کچھ خبر لی جائے۔ اور ان سے پوچھا جائے کہ یہ منافقت کب تک؟ یہ جانبداری، کنبہ پروری کب تک ....اور یہ ادب کے نام پر تجارت کب تک .....

(۲)

ہم جس لمحہ رواں سے گزر رہے ہیں، یہ لمحہ ہمیں بسر کر رہا ہے۔ اگر ہم اس لمحے میں اپنی زندگی کا ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کرتے تو کم از کم آج ہمارے ادب کی مجموعی صورتِ حال کچھ مختلف ہوتی۔ اگر ہم اپنا اصلی فرض ادا کرنے سے اتنے ہی قاصر رہ چکے ہوتے تو کم از کم ہم نفرت کا اظہار تو کر سکتے تھے۔

I HAVE NO GUN ..... BUT I CAN SPIT.

آڈن نے کہا تھا۔ ہم تھوک بھی نہیں سکتے۔ شاید ہمارے حلق اس حد تک خشک ہو چکے ہیں۔

(۳)

ایرخ فروم کی کچھ کتابوں کا ہمارے ہاں شہرہ رہا ہے۔ کچھ مضامین بھی اردو میں منتقل ہوئے ہیں۔ ایرخ فروم کی ایک کتاب ہے..... BEYOND THE CHAINS OF ILLUSION یہ ایک غیر معمولی نوعیت کی کتاب ہے۔ اس کتاب کا موضوع بڑا فکر انگیز اور قدرے حیرت انگیز ہے۔ اس کتاب میں ایرخ فروم نے کارل مارکس اور فرائیڈ کے افکار کو ایک نئے مطالعاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ اور فرائیڈ اور کارل مارکس۔ جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد سمجھے جاتے

ہیں۔ ان کے ہاں فکری اشتراک اور متشابہات کو تلاش کیا ہے۔ اسی اشارے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی کیا اہمیت بنتی ہے۔ اس کتاب کا ابتدائیہ، جو ایرخ فروم نے اپنے تجربات و مطالعات کے حوالے سے لکھا ہے اس کے بعد اقتباسات پیش کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

ایرخ فروم لکھتا ہے۔ اسی کے الفاظ میں ____ "I HAVE ALSO KNOWN TAAT I WAS TEMFERMENTALLY NOT SUITED FOR POLITICAL ACTIVITY. THUS I DID NOT PHRTICIPATE IN ANY UNTIL RECENTY, WHEN I JOINED THE AMBRICHI SOCIALIST PARTY AND BECAME ACTIVE IN THE PEACE MOVEMENT. I DID THIS NET BECAUSE I HAD CHANGED MY OPINION WITH REGARD TO MY ALEILITIES, BUT BECAUSE I FELT TO BE MY DUTY NOT TO REMAIN PASSIVE IN A WORLD WHICH SEEMS TO BE MOVING TOWARDS A SELF CHOSEN CASTAROPHE I HASTEN TO ADD THAT THERE WAS MORE TO IT THAN A SENSE OF OBLIGATIONTHE MORE INSANE AND DE HUMANILED THIS WORLED THIS WORLD OF OURS SEEMS TO BECOME, THE MORE MAY AN INDIVIDUAL FEEL THE NEED OF BEING TOGATER WITH MEN AND WOMEN WHO SHARED ONE'S HUMAN CONCERNS. (P.P.10).

(۵)

ایرخ فروم۔ مفکر، ماہر نفسیات، تحلیل نفسی کا عامل، فرائیڈ کا پیروکار ــــ کارل مارکس کو فرائیڈ کے مقابلے میں بہت بڑا انسان، مفکر اور تاریخ ساز سمجھتا ہے۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ اس کتاب میں مارکس اور فرائیڈ کا نام ایک ساتھ لینے سے ممکن ہے یہ تاثر پیدا ہو کہ میرے نزدیک یہ دونوں یکساں حیثیت رکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ مارکس تاریخی اہمیت سے اتنا ممتاز ہے کہ فرائیڈ کا اس سے موازنہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ ایک مفکر کی حیثیت سے مارکس کے ہاں جو گہرائی، عمق اور وسعت ہے۔ وہ فرائیڈ کے مقابلے عظیم تر ہے۔"

(۶)

ڈی۔ ایچ۔ لارنس پر ایک کتاب۔ رچرڈ آلڈنگٹن نے لکھی تھی۔ لارنس پر لکھی جانے والی کتابوں میں اس کتاب کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ لارنس کی ذات اس کی تخصیص۔ ایک آئینہ بن کر اس کتاب میں سامنے آتی ہے۔ اس کتاب کے آخری باب۔ کو آلڈنگٹن نے ____ THE WORLD'S REJECTED GUEST.

کاعنوان دیا تھا۔ ہمارے ہاں آج بھی اپنے تمام تر دعووں کے باوجود ۔ لارنس جیسا کوئی شخص ادب نے پیدا نہیں کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں کے ادیبوں میں وہ بات ہی نہیں کہ دنیا ان کو ایک ٹھکرائے ہوئے مہمان کا درجہ دے سکے۔ ہمارے ہاں تو ادیب۔ معمولی دعوت ناموں اور ضیافتوں میں جانے کے لئے اپنی ساری اصول پسندیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ پھر بھلا۔ "دنیا" اسے کیسے ٹھکرا سکتی ہے؟"

(۷)

آخر یہ ادیب و شاعر، فن کار حضرات ہوتے کیا ہیں؟ یہ موضوع دلچسپ بھی ہے۔ عبرت ناک بھی۔ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا کہ اس پر کوئی زور دار فکر انگیز بات کروں۔ میں تو ایک پرجوش قسم کا طالب علم ہوں۔ اور اس سوال کے حوالے سے مجھے پھر ایک کتاب یاد آ رہی ہے۔

اینگس ولسن نے بڑے کام کئے ہیں۔ اس کا ایک بڑا کام رڈیارڈ کپلنگ کے فن اور شخصیت پر اس کی کتاب ہے: "THE STRANGERIDE OF RUDYARD KIPLING" بلاشبہ یہ ایک بڑا کام ہے۔ اردو اسالیب کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ ولسن نے حق ادا کیا۔ اس کتاب کی تکمیل کے لئے اس نے برصغیر کا دورہ کیا ان گنت لوگوں سے ملا۔ ان گنت کتابوں سے استفادہ کیا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ سوانح نگار اینگس ولسن نے رڈیارڈ کپلنگ کی زندگی اور اس کے کام پر کتاب لکھتے ہوئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن اسے میں اینگس ولسن کی ناقدانہ بصیرت اور دیانت سمجھتا ہوں کہ کتاب کے آخری پیراگراف میں اس نے رڈیارڈ کپلنگ کے بارے میں اپنی ناقدانہ رائے بھی دی ہے۔ کیا یہ حیران کن بات نہیں کہ ساڑھے چار سو سے زائد صفحات آپ کئی برسوں کی تحقیق کے بعد ایک شخص کی زندگی اور کام پر لکھتے ہیں۔ پھر بھی آپ اسے صفِ اول کا لکھنے والا نہیں سمجھتے ۔ اور نہ وہ آپ کے پسندیدہ لکھنے والوں میں آتا ہے۔ اینگس ولسن لکھتا ہے:

رڈیارڈ کپلنگ کی بہترین کہانیاں بھی اُسے دنیا کے بہترین اور صفِ اول کے لکھنے والوں میں جگہ نہیں دے سکتیں۔ وہ میرے پسندیدہ فن کاروں میں سے دوستوویفسکی، ٹالسٹائی، رچرڈسن، چارلس ڈکنز، ستاں دال اور پروست کی صف میں کھڑا نہیں ہو سکتا اور اگر ہوتا ہے تو صرف اس زاویہ نگاہ سے کہ جس پر کام ہو، اس کو عظیم ثابت کیا جائے خواہ عظمت اُسے چھو کر بھی پاس سے نہ گزر رہی ہو۔

(۸)

'ابوالاثر۔ بچشم اہلِ نظر' کا مطالعہ کیجئے۔ فرق صاف ظاہر ہو جائے گا۔ 'اہلِ نظر' کی تعریف اس کتاب میں یہ ہے کہ جنھوں نے ابوالاثر پر تحسین و داد کے ڈونگرے برسائے ۔!

(۹)

بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ بات ہو رہی تھی۔ یہ ادیب و شاعر حضرات کیا ہوتے ہیں۔ اس سے مجھے اینگس ولسن یاد آیا۔ اور پھر اس کی کتاب۔ بیچ میں اینگس ولسن کی نقادانہ دیانت کا ذکر ہو گیا۔ اینگس ولسن لکھتا ہے

کہ روڈیارڈ کپلنگ نے ایک جملہ کہیں لکھا ہے: "OUTSIDE HIS ART, AN ARTIST MUST NEVER DREAM" اینگس ولسن نے اس جملے پر بڑا تعجب کیا ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ کپلنگ کے نزدیک اس جملے کے کیا معنی تھے" اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اینگس ولسن اس نظریئے کو غلط سمجھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

" ایک صوفی ہر وقت صوفی ہوتا ہے۔ خواہ وہ ریل گاڑی پکڑ رہا ہو یا کیلے خرید رہا ہو۔ اور یہی بات لکھنے والے پر صادق آتی ہے۔ وہ خواب دیکھتا ہے کیونکہ یہ اس کے لئے ناگزیر ہے۔ ایک لکھنے والا فینٹسی اور حقیقی دنیا کو علیحدہ کر کے زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔"

(۱۰)

بہرحال کپلنگ تو ایسے بھی زندہ رہا جس طرح اینگس ولسن کے خیال میں کوئی لکھنے والا زندہ نہیں رہ سکتا۔

کپلنگ کے سوانح نگار کا پالا اردو کے لکھنے والوں یا مخصوص پاکستانیوں سے نہیں پڑا۔ ورنہ جس جس انداز سے یہ لوگ زندہ بھی رہتے ہیں۔ اور لکھتے بھی ہیں۔ حق اور سچائی، انصاف اور حسن کے بینڈ بجتے ہیں۔ اسی طرح ۔ جھوٹ اور باطل ظلم اور بدصورتی کے آگے بھی کبھی چھپ کر، کبھی سامنے آکر نہ صرف سر جھکاتے بلکہ اس کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔

(۱۱)

انسان خطا کا پتلا ہے اور بعض خطائیں بڑی دلچسپ اور حیران کن ہوتی ہیں۔

" لوٹس" کا ایک شمارہ دیکھا۔ یہ اپریل۔ستمبر ۱۹۷۵ء کا شمارہ ہے۔ اس میں منٹو کی کہانی "شہید ساز" کا ترجمہ MARTYRE MAKER کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مترجم سلمیٰ محمود ہیں۔ اسی شمارے میں اس شمارے میں لکھنے والوں کا مختصر تعارف بھی شائع ہوا ہے۔ اس میں منٹو کا تعارف یوں درج ہے:

SAADAT HASSAN MANTO - A SHORT STORY WRITER FROM BANGLADESH THE SENSE OF IRONY WHICH PERVAILS HIS WRITING MANIFESTS THE CONTRADICTION OF LIFE. (P.P. 190)

یہ درست کہ ۔ جب منٹو کا انتقال ہوا تو پاکستان دولخت نہ ہوا تھا۔ لیکن ۱۹۷۵ میں شائع ہونے والے لوٹس میں منٹو کو بنگلہ دیش کا کہانی کار بتایا گیا ہے۔ حالانکہ منٹو کا تعلق بنگلہ دیش سے کب رہا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ فیض صاحب ۱۹۷۵ء میں بھی لوٹس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شریک تھے (اب وہ اس کے چیف ایڈیٹر ہیں) فیض صاحب کے ہوتے ہوئے بھی یہ غلطی ہوئی۔ پھر بعد کے شماروں میں اس کی تردید بھی نہ کی گئی۔

(۱۲)

خطائیں کس سے نہیں ہوتیں۔ لیکن اگر ذرا توجہ دی جائے تو کچھ خطائیں یقیناً سرزد ہونے سے بچ سکتی ہیں زولا کو بھی سنین کے بارے میں ہمیشہ گھپلا ہو جاتا تھا۔ ماہ و سال ناولوں میں آگے پیچھے ہو جاتے۔ زولا

بھول جاتا۔ کہ پیچھے کون سا سین لکھ رہا ہے۔ اصل فرانسیسی ناولوں کا تو مجھے علم نہیں۔ لیکن انگریزی میں ترجمہ ناولوں کے مترجم حواشی دے کر تصحیح کر دیتے تھے کہ یہاں زولا سے بھول ہوئی ہے۔ لیکن بعض اقسام اس بھول چوک کی خاص دلچسپ بلکہ مضحکہ خیز ہوتی ہے

(تخلیق کے شمارہ ۷-۸ (۱۹۸۲) میں خواجہ احمد عباس کی ایک کہانی پانچ گھرٹوں کا تاج محل شائع ہوئی ہے۔ بڑی بے کار، فضول کہانی ہے۔ خواجہ احمد عباس نے ڈھیروں لکھا ہے لیکن اچھا بہت کم لکھا ہے۔ اس ڈھیروں بے کار چیزوں میں یہ کہانی بھی ایک اضافہ ہے۔ اس کہانی کو بیان کرتے، لکھتے ہوئے خواجہ احمد عباس بھول گئے کہ چند سطریں پہلے وہ کیا لکھ گئے تھے۔ اور اب کیا لکھ رہے ہیں۔

تخلیق کے صفحہ ۳۹ کی سطر ۸-۹ میں کہانی کا ہیرو موچی۔ لکشمی کے پاؤں کا ماپ لینے گیا ہے۔ وہاں یہ جملہ ہے "میں نے کوئلے سے پیر کے چاروں اور لکیر کھینچ دی"..... رات بھر وہ موچی بھوکا رام لکشمی کی جوتیاں تیار کرتا ہے۔ اگلے دن دوپہر کو وہ جوتیاں لے کر لکشمی کے ہاں پہنچتا ہے۔ لکشمی کو یقین نہیں کہ اس نے اتنے مختصر عرصے میں جوتیاں بنالی ہوں گی۔ اب ذرا اسی صفحے کی آخری دو سطریں پڑھئے..... لکشمی کہتی ہے۔ "پھر کیوں آگیا۔ کیا پھر میرے پاؤں میں اپنی پلسن سے گدگدی کرے گا۔"

چند سطروں کے بعد افسانہ نگار بھول گیا کہ اُس کے ہیرو نے کوئلے سے پیر کا نقشہ اتارا تھا۔ اور وہ لڑکی زبان سے کوئلے کی بجائے پلسن (پنسل) کہلواتا ہے۔ اب ایسا تو ہونے سے رہا کہ لکشمی کو کوئلے اور پنسل کا فرق معلوم نہ ہو جب کہ وہ کوئلہ زیادہ بہتر تلفظ کے ساتھ ادا کر سکتی تھی۔ مگر بہرحال۔ کوئلہ۔ پلسن بن گیا۔ اور نہ افسانہ نگار کو خیال رہا۔ اور نہ مدیران کو۔ کہ اس تضاد کو دور کردیں۔

(۱۳)

ڈاکٹر معین الرحمٰن کا شمار ہمارے ملک کے اہم استادوں اور محققوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن "رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی" مرتب کر چکے ہیں۔ یہ ایک مشکل کام تھا، جس سے وہ عہدہ برا ہوئے۔ انھوں نے رشید احمد صدیقی کی تحریروں کو اس طرح سلیقے سے ترتیب دیا کہ ان کی آپ بیتی معرضِ وجود میں آگئی مگر ایک معاملے میں وہ بھی چوک گئے۔ یا پھر دانستہ انھوں نے قارئین کو اہم معلومات سے بے خبر رکھا۔ (جن میں اغلب یہی ہے کہ وہ بھول گئے۔ مگر ان جیسے محقق سے یہ بھول بڑی عجیب لگتی ہے)

کتاب میں انھوں نے رشید احمد صدیقی کا شجرہ نسب بھی دیا ہے۔ ان کی اولاد کے بارے میں تمام کوائف پیش کئے ہیں۔ مگر۔ سلمیٰ صدیقی۔ رشید احمد صدیقی کی صاحبزادی کی پہلی شادی کا ذکر تو وہ کرتے ہیں۔ لیکن دوسری شادی کا ذکر سرے سے موجود نہیں۔ جو کرشن چندر سے کی تھی۔ سلمیٰ صدیقی اور کرشن چندر کی شادی .... پر پاکستان کے بعض ادیب اور صحافی خاصے بددل ہوئے تھے اور انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ کہیں ڈاکٹر معین الرحمٰن بھی اسی تعصب کا شکار تو نہیں ہو گئے۔ کہ سلمیٰ صدیقی کی کرشن چندر کے ساتھ شادی کا ذکر کرنا انھوں نے مناسب نہ سمجھا ہو۔ مگر تحقیق و معلومات کی فراہمی کے باب میں ان کی یہ غلطی۔ چھوٹی غلطی

نہیں کہی جاسکتی — !

(۱۴)

ویسے مجھے اس سے دلچسپی نہیں کہ کرشن چندر نے سلمیٰ صدیقی سے شادی کرنے کے لئے مذہب تبدیل کر لیا تھا۔ اور اپنا نام 'وقار الملک' رکھ لیا تھا۔ بہرحال یار لوگ یہ بات بھی اڑاتے ہیں۔ لیکن جو کرشن چندر کی شخصیت اور ان کے کام کو چاہتے ہیں۔ ان کے لئے کرشن چندر کا احترام کبھی اس سے محو نہیں ہوسکتا۔ خواہ وہ وقار الملک ہی کیوں نہ بن گئے ہوں۔

(۱۵)

کرشن چندر — حسن پرست تھے۔ بہت حساس تھے۔ سلمیٰ صدیقی نے لکھا ہے کہ ایک بار جب وہ سرخ ساڑھی پہنے ہوئے تھیں تو ان کی ساس — کرشن چندر کی والدہ نے ان کو ٹوکا کہ وہ سرخ ساڑھی اتار دیں۔ کیونکہ کرشن چندر کو دل کا ایک دورہ پڑ چکا ہے اور سرخ رنگ ان کے جذبات کو اتھل پتھل کرسکتا تھا۔ جو ان کی صحت کے لئے مضر ہوگا۔

(۱۶)

IN MY RELIGION THERE WOULD BE NO EXCLUSIVE DOCTRINE, ALL WOULD BE LOVE POETRY AND DOUBT. LIEE WOULD BE SCARED, BECAUSE IT IS ALL WE HAVE AND DEATH, OUR COMMON DENOMINATOR, THE FOUNTAIN OF CONSIDERATION. THE CYCLE OF THE SEASONS WOULD BE RHYTHMICALLY CELEBRATED TOGATHER WITH THE SEVEN AGES OF MAN, HIS IDENTITY WITH ALL LIVING THINGS, HIS GLORIOUS REASON AND HIS SACRED INSTINTUAL DRIVES. (PALINURUS)

(۱۷)

مشفق خواجہ جب پچھلے دنوں لاہور آئے تو ان کا ایک انٹرویو "جنگ" میں شائع ہوا۔ مشفق خواجہ نے بتایا وہ اپنے جریدے کا ایک حصہ ڈاکٹر وزیر آغا کے لئے وقف کرچکے ہیں۔ انٹرویو لینے والے حضرات نے سوال کیا کہ آخر وزیر آغا ہی کیوں — احمد ندیم قاسمی کیوں نہیں —

مشفق خواجہ نے جواب دیا کہ وہ ایسے لوگوں پر کام کرنا چاہتے ہیں۔ جن پر نہ تو کوئی کتاب شائع ہوئی ہو نہ ہی کسی رسالے نے ان پر نمبر شائع کیا ہو۔ مشفق خواجہ کو یہ کہہ کر اپنی جان چھڑانا پڑی کہ اس حصے میں ڈاکٹر وزیر آغا پر اختلافی مضامین بھی شامل ہیں — !

(۱۸)

ایک کہانی کتھا سرت ساگر میں بیان ہوئی۔ اس کا ماخذ اس سے بھی بہت قدیم ہے۔ پھر اس کہانی پر یوسول

بعد — تھامس مان نے ایک کہانی لکھی۔ جو دنیا کی عظیم کہانیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ پھر اسی کہانی کو — برسوں کے بعد کنڑا کے ایک ڈرامہ نگار گریش کرناڈ نے ڈرامے کا رُوپ دیا۔ جس کا نام — HAYALLADANA — اب اسی کہانی کو انتظار حسین نے "نرناری" کے نام سے لکھا ہے۔

کتھا سرت ساگر کی کہانی میں نے انگریزی میں پڑھی۔ مان کی کہانی بھی انگریزی میں کناڈا زبان میں لکھا جانے والا ناٹک بھی انگریزی میں۔ پھر انتظار حسین کی اُردو میں —

مسرت بھرا، حیرت بھرا حظ میں نے ان کہانیوں سے مختلف وقتوں میں حاصل کیا۔ بڑے لکھنے والے ایک ہی کہانی کو اپنے انداز میں لکھتے ہیں تو اصل کی روح کو مجروح کئے بغیر اس کو اور بھی معنی خیز اور بڑی تخلیق بنا دیتے ہیں انتظار حسین نے یادگار بے مثل کہانیاں لکھی ہیں۔ "نرناری" اس میں ایک اور بڑا اضافہ سمجھئے۔

(۱۹)

باگھ — عبداللہ حسین کا ناول ابھی مارکیٹ میں نہ آیا تھا۔ کہ اردو کے ایک لیکچرار سے ملاقات ہوئی۔ جو خود بھی افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے "باگھ" کو نہیں پڑھا تھا۔ کہ ابھی شائع نہ ہوا تھا۔ مگر وہ ادبی نجومی نکلے۔ باتوں باتوں میں میرے علم میں اضافے کے لئے انھوں نے انکشاف کیا کہ عبداللہ حسین کا ناول "باگھ" ہرمن ہیسن کے ناول STEPEN WOLFE سے مستعار ہے۔ چرایا گیا ہے۔ پوچھا۔ آپ نے تو ناول پڑھا ہی نہیں۔ پھر آپ کو کیسے پتہ چلا۔ جواب دیا۔ "میں عبداللہ حسین کو ناول نگار نہیں مانتا۔ اُسے تو اُردو بھی ڈھنگ سے لکھنا نہیں آتی۔ پھر میں جانتا ہوں۔ وہ سرقہ کرتا ہے۔ اور میں نے ہیسن کا ناول پڑھ رکھا ہے۔ 'سٹیپن وولف' کا سیدھا سادہ ترجمہ باگھ کر دیا گیا ہے۔"

میں حیرت سے ان کو دیکھتا ہوں۔ پھر خاموشی سے اُٹھ کر چلا آیا۔ میری عادت مبالغہ آرائی اور ہوائیاں اڑانے کی نہیں۔ جی تو چاہتا ہے کہ ان لیکچرار صاحب کا نام بھی بتا دوں۔ مگر خیر چھوڑ دیتے۔ جن صاحب کی اپروچ ادب کے بارے میں علم نجوم کے حوالے سے ہو۔ ان کے نام کا ذکر کرنا کیا ضروری ہے — !

(۲۰)

"باگھ" ایک ناول ہے۔

جب میں ناول کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو ناول کے بارے میں جانتا ہوں۔ کہ کسے ناول کہتے ہیں۔ اور ناول کے نام سے شائع ہونے والی ہزاروں کتابوں کو سرے سے ناول ہی نہیں کہا جا سکتا۔

عبداللہ حسین نے 'باگھ' لکھ کر اپنی برتری کا پھر احساس دلایا ہے۔ اردو کے وہ اُستاد جو عبداللہ حسین کی زبان کو صحیح نہیں سمجھتے۔ جب وہ اس ناول میں بعض الفاظ پڑھیں گے تو یقیناً سٹپٹا جائیں گے، مگر اُسے کیا لکھئے گا۔ کہ آپ کسی تھانیدار کے منہ میں کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان نہیں ڈال سکتے۔

ایک اور ناول جسے مجھے پڑھنے کا پچھلے دنوں موقع ملا۔ وہ غلام الثقلین نقوی کا ناول "میرا گاؤں" ہے۔ پنجاب کے دیہات پر جو چند ناول لکھے گئے اور جو مجھے یاد آ رہے ہیں۔ ان میں دو ناول نولونت سنگھ کے ہیں "رات چور اور چاند" اور "کالے کوس" ایک ناول انگریزی میں خوشونت سنگھ کا — TRAIN TO PAKISTAN ہے۔ اور دو ناول پنجابی میں افضل احسن رندھاوا کے ہیں۔ پنجاب کی دیہی زندگی پر تو بہت لوگوں نے لکھا ہے۔ اور نام بھی کمایا ہے۔ لیکن دیہی زندگی پر اُردو میں ناول کم ہی ملتے ہیں۔ "میرا گاؤں" ان سب ناولوں سے مختلف اور منفرد ہے۔ جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس ناول میں گاؤں ہی مرکزی کردار ہے۔ ریومر گاؤں کے ناول THE RIVER کی طرح۔ کہ جس میں دریا مرکزی کردار ہے۔ زمین — اس ناول کی رُوح ہے۔ جو بدلتے موسموں سے یہ اثر لیتی ہے۔ دیہات کی فضا اور ماحول کو شاید ہی کسی اردو یا پنجابی ناول میں اتنے بہتر اور تخلیقی انداز سے پیش کیا گیا ہو۔ جیتا جاگتا، رستا بستا اور اُجڑتا ہوا گاؤں تمام پہلوؤں سے اس ناول میں پیش ہوا ہے۔ غلام الثقلین نقوی کا یہ ناول اس لئے بھی مجھے پسند آیا کہ اس میں جذباتیت اور سطحیت بہت کم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بات کو کہاں ختم کرنا ہے۔ کس بات کو کس حد تک بیان کرنا ہے۔ کہاں رمز و کنایہ سے کام لینا ہے۔ ان کے ہاں ایسا معنی خیز اور تہہ دار ایجاز ہے جس پر سینکڑوں تفصیلات کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو بھی کھلونا نہیں بناتے۔ دیہات میں جس طرح لوگ ...... جذبوں کو محرومیوں میں تبدیل ہوتے دیکھ کر زندگی گزارتے ہیں۔ اس کا صحیح اظہار اس ناول میں ہوا ہے۔ یہاں بھی اچھے بُرے لوگ ہیں۔ لیکن مصنف کا رویہ ناظر کا ہے۔ ان میں رنگ آمیزی نہیں کرتا۔ نہ ہی کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے۔ گاؤں کے موسم، گاؤں کی بوباس، گاؤں کا معاشرہ ہی معلوم دیتا ہے۔

'میرا گاؤں' اردو ناولوں میں ایک خوشگوار، خوبصورت اور معنی خیز اضافہ ہے۔

(۲۲)

ویسے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ 'میرا گاؤں' کا موازنہ — انتظار حسین کے ناول 'بستی' سے کس طرح ہو سکتا ہے۔ مگر کیا کیجئے، اپنی اپنی اپروچ ہے۔ اپنا اپنا خیال اور اپنا اپنا ظرف — ان دونوں ناولوں میں — اس سے علاوہ کوئی قدر مشترک نہیں کہ یہ دونوں ناول ہیں۔ ان ناولوں کے کردار مختلف دنیاؤں میں بستے ہیں۔ ان کے خالق مختلف طرز احساس کی نمائندگی کرتے ہیں — مگر یار لوگ — شوقِ تنقید میں انمل اور بے جوڑ چیزوں میں بھی تو کوئی قدر مشترک تلاش کر کے — اپنی علمیت کا اظہار کرنا اور دور کی کوڑی سونے کا سہرا سر پر باندھنے کو تیار رہتے ہیں!

عاشق روشنی کے

رشید عارف

شام ہوتے ہی پتنگے فضا میں اڑنے لگے کبھی اوپر کبھی نیچے، اندھیرے میں وہ اس طرح اڑ رہے تھے کہ جیسے قلابازیاں کھا رہے ہوں۔ بچارے پتنگے! ان کی زندگی ہی کیا ہے، شام کی اداسی میں اڑنا ہی ان کا مقدر ہے! کہتے ہیں کہ یہ آوارہ گرد ہیں اودھم مچاتے ہیں! کسی کو چین سے رہنے نہیں دیتے۔ پریشان کرتے ہیں! پتہ نہیں یہ سچ ہے کہ جھوٹ! مگر ہاں! یہ اپنی اس عادت سے مجبور ہیں کہ جہاں انہیں روشنی نظر آئی یہ اس پر نثار ہونے چلے! کتنے نادان ہیں بچارے!

اندھیرا گہرا ہوتے ہی دور ایک چھوٹے سے کچے مکان میں کسی دبلے پتلے خستہ حال شخص نے طاق کے قریب آ کر اس میں ایک چراغ روشن کر دیا۔ ہلکی ہلکی روشنی مکان میں چھا گئی۔ اور کھڑکی سے باہر جھلکنے لگی۔ اس پر نظر پڑتے ہی ایک پتنگا اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔

"ساتھیو! وہ دیکھو روشنی نظر آ رہی ہے!"

"ہاں! ہمیں بھی دکھائی دے رہی ہے!" سب کے سب روشنی کی طرف دیکھنے لگے۔

"چلو اس طرف!" اسی پتنگے نے کہا۔

سارے پتنگے اسی طرف لپکے۔ وہ اڑتے ہوئے اس کچے مکان میں جا گھسے اور چراغ کے قریب پہنچ کر اس کے گرد منڈلانے لگے۔ وہ خوش تھے کہ انہیں روشنی مل گئی ہے! بچارے نادان پتنگے یہ نہیں جانتے تھے کہ جس روشنی کے گرد وہ منڈلا رہے ہیں وہ دراصل آگ ہے۔ جو انہیں جلا دیگی یہی ہوا۔ چراغ کے گرد منڈلاتے ہوئے وہ ایک ایک کر کے مرنے لگے۔ جل بھن کر چراغ تلے گرنے لگے۔ ان میں ایک پتنگا ذرا سیانا تھا۔ وہ چراغ سے دور دور اڑ رہا تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا تو چراغ سے اور پرے ہٹا اور اڑ کر دروازے سے باہر نکل گیا اس کی قسمت اچھی تھی کہ مکان کی کھڑکی کھلی تھی اگرچہ دروازہ بند ہو چکا تھا۔

صبح کا اجالا ہوتے ہی اس دبلے پتلے خستہ حال شخص نے طاق کے قریب آ کر پھونک سے چراغ بجھا دیا۔ چراغ تلے کئی پتنگے مرے پڑے تھے۔ اس نے مرے ہوئے پتنگوں پر بے نیازی سے ایک نظر ڈالی اور ہاتھ میں جھاڑو لے کر، چراغ ہٹا کر جھاڑو سے مرے ہوئے پتنگوں کو نیچے گرا دیا۔ پھر انہیں جھاڑو سے کھدیر کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔ سویرے وہ سیانا پتنگا مکان کے دروازے پر آ کر اڑنے لگا۔ اپنے ساتھیوں کا آخری دیدار کر کے وہ تیزی سے اڑتا ہوا ایک طرف کو نکل گیا

دوسرے دن شام ہوتے ہی پھر پتنگے جمع ہوئے اور فضا میں اڑنے لگے۔ اندھیرا چھاتے ہی اسی شخص نے مکان میں چراغ روشن کر دیا۔ پتنگوں نے روشنی دیکھی تو ان سے نہ رہا گیا۔ وہ روشنی کی طرف کھنچنے لگے۔ ایک ایک اسی مکان کا رخ کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر اس سیانے پتنگے نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔

"ساتھیو! اس روشنی کی طرف بھول کر بھی نہ جاؤ!"

"کیوں؟" دوسرے پتنگوں نے اسے گھیر کر اڑتے ہوئے پوچھا۔

"اس لئے کہ وہ روشنی جو ہمیں نظر آ رہی ہے۔ وہ روشنی نہیں آگ ہے! اور ہم آگ پر کیوں نثار ہوں؟ ہمیں روشنی چاہیئے جو ہمیں کبھی نہ کبھی نظر آئے گی!"

"تو جھوٹ کہہ رہا ہے۔ سامنے روشنی تو ہے! دیکھتا نہیں، کتنی خوشنما نظر آ رہی ہے! کتنی بھلی لگ رہی ہے۔ ہم پتنگے روشنی سے دور نہیں رہ سکتے! ہم اس کے قریب ضرور جائینگے تجھے جلنا ہے تو چل! ہمیں اس کے قریب جانے سے مت روک! بڑی دیر کے بعد یہ روشنی ہمیں نظر آئی ہے!"

اس نے بہت روکنے کی کوشش کی لیکن کسی پتنگے نے اس کی بات نہیں مانی،

کوئی بھی نہیں رُکا۔ سب کے سب اس روشنی کی طرف اڑ گئے۔ رات بھر اس نے ان پتنگوں کا انتظار کیا لیکن ان میں سے ایک بھی واپس نہیں لوٹا۔

پھر شام ہوئی اور پتنگے فضا میں اڑنے لگے۔ اندھیرے میں اسی مکان میں انہیں روشنی نظر آئی۔ مگر اب جو روشنی انہیں نظر آ رہی تھی، ایسی روشنی انہوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سارے مکان سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ مکان جگمگا رہا تھا۔ بھلا وہ کب اس روشنی سے دور رہ سکتے تھے۔ اس روشنی کی کشش نے اس سیانے پتنگے کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اپنے ساتھیوں سے اس نے کہا

"دوستو چلو اس روشنی کی طرف! ہم جو روشنی چاہتے تھے وہ ہمیں نظر آ رہی ہے! ہم اس سے دور نہیں رہیں گے چلو جلدی اڑو!"

اس کے یہ کہتے ہی سارے پتنگے دیوانہ وار اس مکان کی جانب اڑنے لگے۔

مکان کے قریب پہنچتے ہی پتنگوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے بڑی عالی شان اونچی حویلی کھڑی ہے! برقی قمقمے اس میں روشن ہیں۔ قمقموں سے مختلف رنگ کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ کھڑکی دروازے بند ہونے کی وجہ سے انہیں اندر داخل ہونے کا کہیں کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس ادھیڑبن میں تھے کہ حویلی میں کس طرح داخل ہوا جائے۔ اتنے میں اس سیانے پتنگے کو ایک کھڑکی کے شیشے میں ذرا سا سوراخ نظر آیا۔ وہ فوراً سوراخ سے اندر گھسا۔ اندر پہنچتے ہی اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ رنگ برنگے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ اس طرح کے قمقمے اس نے پہلی بار دیکھے تھے۔ وہ ان پر ہزار جان سے فدا ہو رہا تھا۔ اتنی ٹھنڈی پرکشش، خوشنما اور رنگ رنگ کی روشنی اسے آج ہی دیکھنا نصیب ہوئی تھی۔ اسی روشنی کے ہجر میں اس نے کئی اداس شامیں گذاری تھیں۔ کئی صدمے برداشت کئے تھے۔ اسے وہ روشنی مل گئی جس کا اسے انتظار تھا۔ وہ اب اس سے کبھی جدا نہیں ہوگا۔ اس نے سوچا کہ اپنے ساتھیوں کو کسی طرح خبر کرنی چاہئے انہیں کسی صورت سے اندر لانا چاہئے۔ وہ ابھی ساتھیوں کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر حویلی کے مالک پر پڑی۔ پہلی ہی نظر میں وہ اسے پہچان گیا اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ارے یہ وہی شخص ہے جو کچے مکان میں چراغ جلایا کرتا تھا۔ یہ کتنا بدل گیا ہے۔ پہچانا نہیں جا رہا ہے! بڑا فربہ نظر آ رہا ہے! یہ سوچتے ہوئے وہ ایک قمقمے پر آ بیٹھا اس نے سوچا کہ اپنے ساتھیوں کو جلد از جلد اندر سے آنا چاہئے! وہ اس روشنی سے کیوں دور رہیں! یہ روشنی ہمیں نہیں جلائے گی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔

"کھڑکی دروازے بند ہیں۔ پھر یہ پتنگا اندر کیسے چلا آیا؟" مالک نے یہ کہتے ہوئے نوکر کو آواز دی۔

"ارے کوئی ہے؟"

ایک نوکر دوڑتا ہوا آیا۔ اتنے میں دوسرے پتنگوں کو بھی اندر آنے کا راستہ مل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے پتنگے حویلی میں داخل ہو گئے۔ اور قمقموں کے اطراف اڑنے لگے۔ یہ دیکھ کر مالک کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اس نے غصہ میں نوکر سے کہا

"جاؤ! جلدی سے بیگان اسپرے لا کر ان پر برساؤ!!"

نوکر نے فوراً حکم کی تعمیل کی وہ بیگان اسپرے سے بھرا پمپ لے آیا اور پتنگوں پر برسانے لگا۔

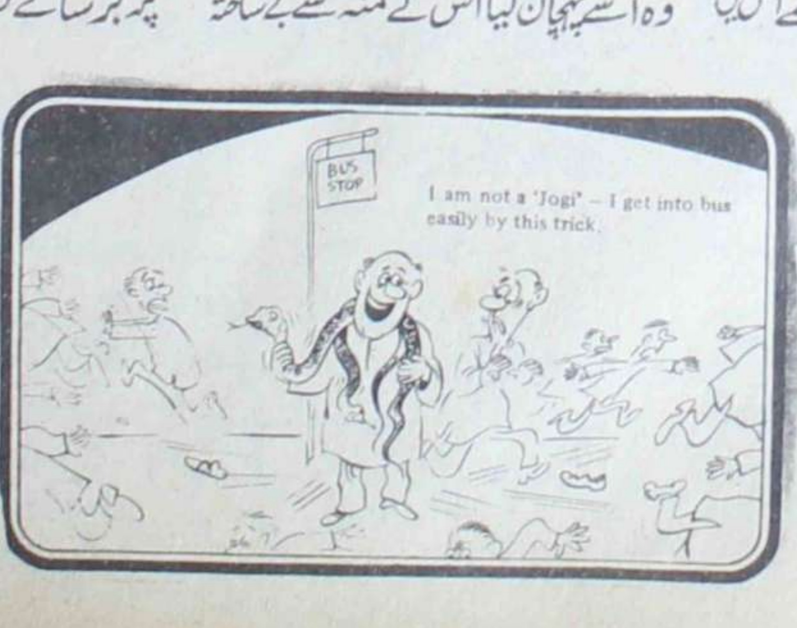

شہر کا کینسر

محمد طارق

شہر کے گندے نالے کے کنارے بسا ہوا محلہ جو ایسا نظر آتا ہے جیسے شہر کا چیچک زدہ علاقہ۔ محلہ میں جھونپڑے۔ بے ڈھنگے ٹوٹے پھوٹے مٹی کے مکانات سڑے ہوئے پانی سے بھری نالیاں۔ جگہ جگہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر جن پر مکھیوں کا بھنبھناتا ہوا ہجوم۔ فضا میں ہمیشہ بدبو بسی ہوئی۔ اگر آپ محلے میں قدم رکھیں گے تو فوراً ناک پر کپڑا ضرور ڈھانپ لیں گے، کیونکہ آپ نے اپنی زندگی جس فضا میں گذاری ہے اس میں صاف آکسیجن کی فراوانی ہوگی۔ رستے صاف شفاف ہوں گے۔ سلیقے کے مکانات ہوں گے۔ اس لئے آپ کا یہاں یکدم دم گھٹ جائے گا آپ کو وحشت ہوگی یہاں جی متلانے لگیں گے ——— یہاں کے لوگوں کے جھونپڑے۔ رہن سہن دیکھ کر اور ان کی بات چیت سن کر آپ اس محلے سے اس طرح بھاگ جائیں گے جیسے بے حیا آدمی کی باتیں سن کر۔ برہنہ آدمی کو دیکھ کر شرمیلی۔ باحیا، عورت بھاگ جاتی ہے۔

میں نے جب اس محلے میں قدم رکھا تھا تب مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا لیکن میں بھاگا نہیں تھا۔ کیونکہ میں مجبور تھا۔ مجبوری آدمی کو ناگوار سے ناگوار ماحول۔ غلیظ سے غلیظ بات برداشت کرنے کے لائق بنا دیتی ہے۔

میری مجبوری یہ تھی کہ مجھے شہر کے تہذیب یافتہ محلوں میں مناسب کرائے پر کمرہ نہیں ملا تھا۔

ہر کمرے کا کرایا سو روپئے سے زیادہ ہی۔ اور میں ساڑھے پانچ سو روپئے کمانے والا ٹیچر سو سے زیادہ کرائے کے کمرے میں کیسے رہ سکتا ہوں بھلا سر چھپانے کے علاوہ زندگی کے اور بھی تو مسائل ہیں جس پر پیسہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ جن میں میرے ذمہ کچھ حقوق بھی شامل ہیں پھر آپ ہی بتائیے میں سو سے زیادہ ماہانہ کرائے کے کمرے میں رہ سکتا ہوں؟ یہی مجبوری مجھے اس محلے میں کھینچ لائی تھی۔ یہاں بیس روپئے مہینے سے مٹی کے دو کمروں پر مشتمل مکان کا ایک کمرہ مل گیا تھا۔

بازو کے کمرے میں مالک مکان رہتا ہے وہ پھلوں کا بیوپاری ہے۔ دن بھر گلا پھاڑ پھاڑ کر پھل فروخت کرتا ہے اور رات میں اپنی تھکی ہاری بیوی کے تھتھلاتے بدن سے کچھ سکون کے لمحات نچوڑتا ہے۔ بیوی سکون کے ساتھ ہر سال ایک بچہ بھی اسے عنایت کر دیتی ہے۔۔۔

اس طرح وہ آج باآسانی دس میلے کچیلے دبلے پیلے۔ بے ڈھب بچوں کا باپ بن گیا ہے بچے جن کا کوئی مستقبل نہیں۔ اور حال بدحال ہے۔ وہ انہیں اپنی آمدنی سے اچھے لباس کیا پورے لباس تک نہیں پہنا سکتا۔ نہ پیٹ بھر کھانا کھلا سکتا ہے۔ وہ آوارہ پلوں کی طرح ادھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں۔۔۔۔

ایسے ہی کچھ ماں باپ اپنے بچوں سے بھیک منگواتے ہیں کچھ چوری کرواتے ہیں اور کچھ ہوٹلوں میں کام۔ کچھ بچے صبح سے شام تک محلے کی گلیوں میں کھیلتے رہتے ہیں۔ غلیظ غلیظ گالیاں بکتے ہیں جو انہیں وراثت میں ملی ہیں۔ بالکل لاوارث لگتے ہیں وہ تمام۔ ایسے جیسے انہیں آسمان نے پھینکا اور زمین نے جھیلی...

محلے کے نوجوان بھڑکیلے رنگوں کی شرٹ سینے کی ٹمنیں کھولے نیلی، پیلی بنیائن دکھاتے ہوئے۔ گلے میں رومال باندھے گال میں پان کی گلوری دبائے۔ بیچ بیچ تھوکتے ہوئے۔ بیڑیاں دھنکتے ہوئے ان کی مفلس جوانی کا رس چوس لینے کے لئے بے چین بھنوروں کی طرح ان کے گرد منڈھلاتے ہیں وہ لونڈے —!

واہیات اشارے کرتے ہیں سٹیاں

بجاتے ہیں۔ گانا گاتے ہیں۔

اور وہ لڑکیاں۔

وہ اپنے جھونپڑوں کے سامنے دروازوں میں کھڑی انہیں دعوتِ شہوت دیتی ہیں آؤ! یہ جوانی کا دسترخوان تمہارے لیے ہی سجا رکھا ہے ہم نے، سیر ہو کر کھا لو! آؤ! ہمارے بدن تمہاری ہی امانت ہیں اس سے پہلے کہ کوئی اس میں خیانت کرے انہیں اپنی باہنوں میں دبوچ لو!

آؤ! ہماری عصمت کو جنہیں ہم مفلسی کی وجہ سے بچا نہیں پائیں گے، خرید لو آج تم ہمارے اپنے ہو — لے لو سستے داموں ہیں۔

اور جب رات کی سیاہی مکمل طور پر پھیل جاتی ہے تب ان میں سے اکثر موقعہ دیکھ کر لڑکیوں کی دعوت پر لبیک کہہ دیتے ہیں

— یہ سب کچھ یہاں عرصے سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ کوئی شرم نہیں کسی کا خوف نہیں — طرہ ہے تو یہ کہ کوئی دعوت کو ٹھکرائے محلّے کے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو منّی بائی کے ہاں دلالی کرتے ہیں

— منی بائی ایک زمانے میں شہر کی مشہور طوائف رہ چکی تھی شہر کے اکثر وبیشتر عیاش اس کا دم بھرتے تھے لیکن اب اس میں وہ چیز نہیں رہی جس کے عیاش خواہشمند تھے۔

اس کا بدن جو کبھی خوبصورت اور کافی کسا کسا تھا اب پھول کر بے ڈھنگا ہو گیا تھا۔ گوشت تھلتھلا گیا تھا اس لئے اب کوئی اس کے بدن کو خریدتا نہیں تھا۔ جس کا اسے دکھ بھی نہیں تھا شاید!

وہ اب ان لڑکیوں کے بدن فروخت کرتی ہے جنہیں زمانے نے ٹھکرایا۔ مفلسی نے روندا۔ اور انہیں اس نے اپنے گھر میں پناہ دی۔

اس کا گھر اسی محلے میں ہے سیمنٹ کا معمولی مکان —

آئے دن وہاں جوان لڑکیاں آتی ہیں اور منی بائی کے اشارے پر اس کے دلال ان کے لیے ہر روز گاہک مہیا کر دیتے ہیں۔

گاہک — مہذب لوگ،

گاہک — رئیس۔ گاہک، ایسے لوگ جو اس محلے والوں کو ذلیل سمجھتے ہیں اوّل درجے کے ذلیل اور کمینے — گاہک وہ لوگ جو عورت کی ایسی قدر کرتے ہیں کہ اسے فاحشہ بنا دیتے ہیں —

اپنے خوبصورت مکانوں سے۔ اپنے تہذیب یافتہ ماحول سے آتے ہیں اپنی سجی سنوری ہوئی بیویوں کو چھوڑ کر منی بائی کے چکلے پر اس غلیظ محلّے میں جو ان کے نزدیک شہر کا کینسر ہے۔

محلے والے بھی جاتے ہیں منی بائی کے چکلے پر۔ وہ بھی گاہک ہیں اپنی ہی طرح مفلس مجبور، ٹھکراتی ہوئی لڑکیوں، عورتوں کے۔

میرا پڑوسی پربھو بھی جاتا ہے جس کی بیوی بغیر اس کے کھانا نہیں کھاتی۔ اور گلابو بھی اپنے مریل بدن کی بودی مستی وہاں اتارتا ہے۔ جس کی بیوی مجھے دیکھ کر غٹاغٹ پانی نگلتی ہے۔ مناسب قدو قامت والی خوبصورت بیوی، بے تاب جوبن والی

— اور میں سر جھکا لیتا ہوں ایک شریف انسان کی طرح لیکن اپنے اندر ایسے بھوکے بھیڑیئے کی طرح تڑپ اٹھتا ہوں جسے زنجیروں سے باندھ دیا گیا ہے اور اس کی نظروں کے سامنے تازہ گوشت رکھ دیا گیا ہے۔

— وہ بھوکا بھیڑیا رات میں میرے تصور کے بستر پر اسے گھسیٹ لاتا ہے اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

گلابو میرے اندر کے بھوکے بھیڑیئے سے بے خبر ہے اس لیے وہ میری بڑی عزت کرتا ہے۔ جب بھی ملتا ہے عقیدت سے مجھے سلام کرتا ہے۔ گلابو ہی کیا محلے کے تمام لوگ مجھے قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

اور میں — ؟!

ایک سوالیہ نشان میرے ذہن کی تختی پر کوئی لکھ دیتا ہے تب میں محسوس کرتا ہوں یہ پستی میں رہنے والے لوگ کتنے بڑے ہیں کتنے عظیم — میں کیا ہوں؟!

رتن ناتھ سرشار
تربھون ناتھ ہجر
مرزا محمود بیگ
سید محمد سجاد حسین
عبدالمجید سالک
کنہیا لال کپور
چراغ حسن حسرت
فکر تونسوی
احمد ندیم قاسمی
ساگر چند گورکھا
ابن انشا
قاضی عبدالغفار
ابراہیم جلیس
شوکت تھانوی
اور ایسے ہی دوسرے

عطاء الحق قاسمی
احمد جمال پاشا
حاجی لق لق
میلا رام وفا
یوسف ناظم
عبدالماجد دریا آبادی
منو بھائی
نیپالی
مجید لاہوری
شاہد صدیقی
سہیل عظیم آبادی
انیس احمد خاں
اور ایسے ہی دوسرے

• کالم نگاری سے عظیم ادیب اُبھرے
• عظیم ادب سے کالم نگاری اُبھری

ثبوت؟

اُردو زبان کا پہلا اور آخری خاص نمبر

کالم نگاری نمبر

مرتب: فکر تونسوی
معاونین: بشیر احمد — انیس احمد خاں
• ڈیمائی سائز — چھ سو صفحات
• قیمت — سو روپے
• آرڈر — چھپنے سے پہلے دیجئے یا بعد کوئی فرق نہیں پڑتا۔

کہنی پر ٹکا ہاتھ

مشرف عالم ذوقی

وہ آج پھر وہیں پڑا ہوا تھا۔ اور آج سے قبل بھی وہ ہمیشہ سے شہر کی اس پُر رونق شاہراہ کے دائیں طرف والی فٹ پاتھ کی نالی کے قریب یوں ہی بے حس و حرکت پڑا رہتا۔ پیسوں کی چھنک تھوڑے وقفے کے لئے اس کے مردہ جسم میں تو انائی پیدا کرتی۔ ورنہ اُدھر سے ہر آتے جاتے لوگوں کے لئے وہ ایک لاش ہی تھا۔ ایک مکروہ لاش۔

اس کے اوپر پڑا ہوا گندہ غلیظ لتھڑا اُس کے جسم کا ہی کوئی انگ لگتا۔ لتھڑے جھانکتا اس کا سکھڑا ہوا چرک کھایا پیر بے حس سا اس لاش نما جسم کے نیچے دبی گدری پر ٹکا ہوتا۔

اسے دیکھ کر کسی ایسے مرے ہوئے کراہت آمیز جانور کا خیال آتا: س کے مردہ جسم پر کیڑے پنپھنا رہے ہوں۔ یا پھر اسے مریل اور سڑے ہوئے جانور کا جو گونگا ہو۔!

بھیڑ۔ چیخ۔ پکار۔ شور۔ افراتفری اور ٹریفک کے بوجھل شور سے بے نیاز۔ وہ ہمیشہ وہیں ایک کونے میں پڑا رہتا۔

اسے ہمیشہ اسی مخصوص جگہ پر دیکھ ایسا لگتا جیسے وہ اس شاہراہ فٹ پاتھ۔ اور بغل سے ہو کر گذرنے والی نالی کا ایک اہم جز بن گیا ہو۔

اس کا بایاں ہاتھ زمین پر لمبوترا ہو کر بے حس و حرکت پڑا رہتا۔

اور دایاں ہاتھ کہنی پر ٹکا ہوتا۔ اوپر کی جانب بالکل سیدھا۔

اسے دیکھ کر ہمیشہ یہی محسوس ہوتا۔ جیسے اس کا پورا جسم مر گیا ہے۔ بس ایک یہی ہاتھ زندہ ہے جو گدریوں پر پھیکے گئے دو چار سکوں کو اٹھانے میں جہاں کارآمد ہے۔ وہیں بہت کچھ بولتا ہوا بھی محسوس ہوتا ہے۔

مثلاً اس کے چہرے پر بھی ڈھنپا ہوتا ہے۔

اسے کر جو کچھ سامنے سے نظر آتا ہے۔ وہ ہوتا ہے پر ٹکا چرکیدہ ہاتھ۔ جو اس کے نیم مردہ ہونے کا احساس پیش کرتا ہے۔

کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا۔ جیسے کہنی پر ٹکے اس چرکیدہ ہاتھ میں اس کا غیر واضح، ڈھنپا ہوا چہرہ پوری طرح ابھر کر سامنے آگیا ہو جس میں اس کی اندر کو دھنسی ہوئی سیلاب زدہ پتلیوں کی طرح بجھ دو آنکھیں بھی ہوں۔ مہک اور بدبو سے نا آشنا ناک بھی ہو۔ اس کے مواد سے بھرے چرکیدہ لب بھی ہوں جن کے پردے سے اس کے سڑے ہوئے بدبودار دانت صاف جھانک رہے ہوں۔

اس طرح کہنی پر ٹکا یہ چرکیدہ ہاتھ اس کا پورا چہرہ بن جاتا۔ جو اپنی پوری کیفیت شاہراہ سے آتے جاتے ہوئے لوگوں کو بتلایا کرتا جس میں بے ضرر گزارش اور التجا کا نا آشنا لمس بھی ہوتا۔ اور جس میں ہمدردی اور مستقل مزاجی کے ٹوٹتے احساس کے پردوں پر ڈولتی مخلصانہ بھیک بھی شامل ہوتی۔

مگر پھر ایسا احساس ہوتا کہ دائیں ہاتھ کی کہنی پر ٹکے اس غیر واضح چہرے کے عکس کو کون محسوس کرتا ہوگا۔ پیچھے لوٹنے اور ٹھہرنے کی فرصت کسے ہے۔ آج تو بس ایک بھاگم بھاگ ہے۔ ایک دوڑ ہے۔ بغیر سمت کا تعین کیے ہوئے دوڑ۔ جس کا کچھ اتہ پتہ نہیں ہے۔

منزل گم ہوگئی ہے۔

اور شہر کی ہر شاہراہ پر ایک نظر نہیں آنے والا سائن بورڈ ٹنگ گیا ہے جس میں جائیے واردات اور حادثے میں مرے ہوئے لوگوں کی فہرست درج ہو۔

——— آج فلاں شخص کچلنے سے مر گیا ایک خبر۔ اس کی جیب سے روزگار سماچار کا ایک ٹکڑا ملا۔ ایکسیڈنٹ 'بیچارہ'۔

——— ایک نوجوان موٹر کے نیچے آگیا۔ وجہ۔ خود کشی۔ اور کچھ۔ بے روزگاری۔

——— ایک عورت ریل کی پٹری سے نیچے آکر کٹ گئی۔ سبب حاملہ ہونا۔ بیچاری!

——— ٹھنڈک سے اینٹھ کر ایک بڑھیا سڑک پر فوت ہوگئی۔ بیچاری۔

لوگ بے لاگ تبصرے کرتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ نظر نہیں آنے والا سائن بورڈ ایسے کتنے ہی سانحوں سے بھر گیا ہے۔

شاہراہ اب بھی لوگوں کے ہجوم سے بھری پڑی ہے۔ ٹریفک کے شور اب بھی آسمان پیٹ رہے ہیں۔ سب کچھ اپنے معمول کی طرح چل رہا ہے۔

وہی اخبار وہی موٹی موٹی سنسنی سرخیاں حادثے۔ ایکسیڈنٹ۔ ریپ۔ لوٹ۔ مار۔ آتش زنی دنگا فساد۔

پھر بڑے بڑے تبصرے۔

مگر اس کہنی پر ٹکے ہاتھ والے شخص کو شاید اس کی کوئی خبر نہیں۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کیا۔ وہ تو بس ان نظر نہیں آنے والے سائن بورڈوں سے قطع نظر فٹ پاتھ کی نالی کے قریب۔ اپنے مکروہ جسم کے ناقابل برداشت بوجھ کو رکھے ڈھو رہا ہے۔

مگر کیا پتہ۔ کل، نظر نہیں آنے والے کسی سائن بورڈ پر اس کا نام بھی چڑھ جائے۔

ٹریفک پھر چیخنے لگا ہے۔ میری آنکھوں کی پتلیاں سکڑ گئی ہیں۔ نہیں نظر آنے والا وہ سائن بورڈ اب صاف صاف دکھائی دینے لگا ہے۔ اس پر لکھی ہوئی عبارت پوری طرح واضح ہوگئی ہے۔

ایک بھکاری۔

نام نہیں معلوم۔ سبب .....؟

میرا ذہن برف گھر بن چکا ہے۔ آگے نہ بڑھ کر میں اس بھکاری کی جانب دیکھتا ہوں۔ اور اس دائیں ہاتھ کی کہنی پر ٹکے اس کے چہرے پر نظر ڈالتا ہوں۔

اس کا کہنی پر ٹکا دایاں ہاتھ جھک کر لمبوترا ہوگیا ہے۔

بے حس ٹھیک بائیں ہاتھ کی طرح۔

شادی کا پیغام

چے خف
انوار رضوی

اس کا پورا نام 'انتون پادلوچ چے خف' تھا۔ وہ ۱۸۶۰ء میں جنوبی روس کے قصبہ تگن روگ میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن مفلسی اور محرومی میں گذرا۔ ۱۸۷۹ء میں وہ ماسکو آگیا۔ یہاں اس کا داخلہ طب کے شعبہ میں ہوگیا اور ۱۸۸۴ء میں تعلیم سے فارغ ہوکر وہ باقاعدہ ڈاکٹر بن گیا۔ تعلیم کے زمانے میں بھی اس نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور رخاکے اخبارات ورسائل کے لئے لکھے جو ظریفانہ تھے اور بہت مقبول ہوئے۔ وہ چے خف کے لئے معقول آمدنی کا ذریعہ بنے۔ ۱۸۸۵ء میں چے خف کی ملاقات گریموری درح سوورن سے ہوئی کہ جو اس زمانے کا نامی ادبی نقاد اور ماسکو کے سب سے بڑے روزنامہ اخبار کا مدیر تھا۔ اس نے چے خف کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا اور اس کو سنجیدہ نگاری پر آمادہ کیا۔ ۱۸۸۷ء میں اس کا پہلا ڈرامہ اسٹیج پر دکھایا گیا اور بہت مقبول ہوا۔ سنجیدہ اور عظیم ڈرامے اس نے عمر کے آخری حصے میں لکھے ہیں۔ اور تب ہی اس کو اپنے قلم کی قوت کا پورا شعور بھی پیدا ہوا ورنہ اپنی زندگی میں وہ طب کو اولیت دیتا اور ادب کو محض ثانوی درجہ پر رکھتا تھا۔ تپ دق کے عارضہ میں مبتلا ہونے کے بعد اور انتقال سے دو تین برس پیشتر چے خف نے ماسکو آرٹ تھیٹر کی ایک ایکٹرس سے شادی کی۔ وہ ماسکو سے پچاس میل دور دیہات میں رہتا تھا جہاں اس نے ایک مکان اور تھوڑی سی آراضی خریدی تھی۔ بیوی سے شاذونادر ملاقات کرتا تھا۔ عمر کے آخری سات برسوں میں وہ تپ دق کے مرض میں گھلتا گیا مگر اس کی تحریر کا یہی زمانہ شباب کا تھا۔

عالمی ڈرامے کے میدان میں چے خف ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مزاحیہ یک بابی ڈرامے بھی خاصے کی چیز ہیں جن میں "شادی کا پیغام" ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ "چے خف کا مزاج بے ساختہ ہنسی کی تحریک دیتا ہے۔ اس کے مزاحیہ کردار مبالغہ آمیز ہوتے ہیں۔ مگر انسانی نفسیات پر اس کی مضبوط گرفت اور مکالمہ کی بے حتی ان کو فطری بنا دیتے ہیں۔ یہ ڈرامہ خاص روسی پس منظر میں ہے۔ مگر اس کی اپیل عالمی ہے۔

کوبوکوف۔ اسٹیپان اسٹیپانووچ۔ ایک زمیندار

نتالیا اسٹیپانوونا (نتاشا)۔ اس کی بیٹی، عمر پچیس سال

لوموف۔ ایوان ویسیلیئے وِچ۔ ایک زمیندار اور کوبوکوف کا پڑوسی
ہٹا کٹا مگر اپنی صحت کے متعلق سخت تشویش میں مبتلا رہنے والا (واقعہ کوبوکوف کی زمینداری میں عمل پذیر ہوتا ہے)

[کوبوکوف کے مکان کا ڈرائنگ روم۔ پردہ اٹھتا ہے تو کوبوکوف اور لوموف نظر آتے ہیں۔ لوموف سفید دستانوں سے لیس شام کے لباس میں ہے]

کوبوکوف (لوموف کی جانب تپاک سے بڑھتے ہوئے) اخاہ، میرے عزیز، میرے دوست، تم کہاں بھول پڑے ؟ ایوان ویسیلیئے وِچ طبیعت باغ باغ ہوگئی! (اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دباتا ہے) بھئی کمال ہے، برخوردار... کیا حال چال ہے ؟

لوموف۔ عنایت، مہربانی، آپ کا مزاج کیسا ہے ؟

کوبوکوف۔ ٹھیک ہی ہے، عزیز من، شکر ہے اس پاک پروردگار کا۔ جس حال میں رکھے۔ بیٹھو بیٹھو.... آخر تم کو خیال آہی گیا کہ پڑوسیوں کی بھی خیر خبر لیتے رہنا چاہئے۔ لیکن دوست اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی؟ شام کا لباس ڈانٹے ہو، دستانے اور یہ سب کیا کسی خاص آدمی سے ملاقات کے لیے جا رہے ہو یا کچھ اور، کیوں برخوردار؟

لوموف۔ نہیں تو بس آپ سے ہی ملنے نکلا تھا، جناب اسٹیپان اسٹیپانووِچ۔

کوبوکوف۔ پھر یہ ٹھٹے دار کوٹ کس لیے برخوردار ؟ تم کو دیکھ کے لگتا ہے۔ جیسے نئے سال کی کسی پر تکلف دعوت میں جانے کو نکلے ہو۔

لوموف۔ دیکھئے، ایسا ہے (اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے) میں آپ سے ہی ملنے آیا ہوں، جناب اسٹیپان اسٹیپانووِچ، ایک خاص معاملے میں آپ کی عنایت چاہتا تھا۔ اگر آپ کو ناگوار خاطر نہ ہو تو۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ایک نہیں کئی بار آپ سے مدد کا طالب ہوا ہوں، اور ہمیشہ ہی آپ نے مجھے نوازا، بات یہ ہے کہ ___ معاف کیجئے گا کہتے نہیں بن رہا... میں تھوڑا پانی پینا چاہوں گا جناب اسٹیپان اسٹیپانووِچ (پانی پیتا ہے)

کوبوکوف (علیحدہ) یہ حضرت قرض مانگنے آئے ہیں! ایں دھیلا

نہیں دو گا! (لوموف سے) بات کیا ہے، میرے پیارے خوش جمال دوست؟

لوموف۔ دیکھئے جناب اسٹیپان ۔۔۔۔ معاف کیجئے گا، اسٹیپان، میرا مطلب، عزیز محترم ۔۔۔۔ دیکھئے، بڑی گھبراہٹ کا سامنا ہو گیا ہے، آپ دیکھ ہی رہے ہیں ۔۔۔۔۔۔ مختصر طور پر عرض یہ ہے کہ آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کے لائق نہیں ہوں ۔۔۔۔ اور آپ پر میرا کوئی حق بھی نہیں ہے۔۔

کوبوکوف۔ اتنا طول مت دو، برخوردار! کہہ ڈالو کیا بات ہے؟

لوموف۔ ٹھیک ہے ۔۔۔۔ اسی گھڑی سہی ۔۔ اصل بات یہ ہے، میں آپ کی صاحبزادی نتالیا اسٹیپانو ونا کا ہاتھ مانگنے حاضر ہوا ہوں۔

کوبوکوف (خوشی سے اچھلتے ہوئے) ارے واہ میرے پیارے! ایوان ویسیا لئے وچ! ایک بار پھر سے کہو۔ میں ٹھیک طرح سن نہیں پایا!

لوموف۔ میں اس کو اپنی عزت افزائی سمجھوں گا اگر آپ ۔۔۔۔

کوبوکوف۔ میرے بچے ۔۔۔۔۔ مجھے بے حد خوشی ہے ۔۔۔۔۔۔ ہاں واقعی دل خوش کر دیا (گلے سے لگاتا اور چومتا ہے) بڑی مدت سے میں امید کر رہا تھا۔ میں تو مینہ کی طرح اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ (ایک آنسو جھٹکتا ہے) میں نے ہمیشہ تم کو عزیز رکھا ہے، میرے بچے، بالکل اپنا بیٹا ہی سمجھا ہے تم کو۔ خداوند کریم تم دونوں کو شاد و آباد رکھے اور ہمیشہ میں امید لگائے رہا ۔۔۔ میں اُلو کے چرخے کی طرح یہاں کھڑا کیوں ہوں؟ میں خوشی کے مارے سٹپٹا گیا ہوں، بالکل ہکا بکا رہ گیا ہوں! اوہ، روح کی گہرائیوں کے ساتھ ۔۔۔۔ میں ابھی جا کر نتاشا کو بلاتا ہوں۔

لوموف۔ (جذباتی ہو کر) جناب اسٹیپان اسٹیپانو وِچ آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا میں آپ کی صاحبزادی سے ہاں کی امید رکھوں؟

کوبوکوف۔ بالکل، یقیناً، میرے بچے ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔ جیسے وہ منع ہی کر دے گی! وہ تو تمہاری محبت میں گلے گلے ڈوبی ہے ۔۔۔ سمجھے ۔۔۔۔ میں ابھی آیا! (باہر نکل جاتا ہے)

لوموف (تنہا) میں برف ہو رہا ہوں ۔۔۔۔ اوپر سے نیچے تک تھرتھری آ رہی ہے، لگتا ہے ابھی کوئی امتحان دینے والا ہوں۔ اصل بات تو ارادہ پکا رکھنے کی ہے۔ اگر زیادہ سوچ بچار کیا جائے، خواہ مخواہ کی جھجک میں آدمی پڑ جائے، باتیں طول طویل کرے، سپنوں کی رانی کی تلاش میں مارا مارا پھرے، تو بس آدمی شادی کر چکا ۔۔۔۔ بڑی ٹھنڈک ہے! نتالیا اسٹیپانو ونا بڑی سگھڑ لڑکی ہے، شکل و صورت میں بھی بری نہیں ہے پڑھی لکھی ہے ۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیئے؟ لیکن مجھ پر بڑی گھبراہٹ سوار ہو رہی ہے، کانوں میں شائیں شائیں ہو رہی ہے۔ (پانی پیتا ہے) میرے لیے شادی کا نہ کرنا بڑی ناممکن بات ہے ۔۔۔ پہلی بات تو یہ ہے میں پینتیس برس کا ہو چکا ہوں دیکھا جائے تو یہ عمر کا خطرناک موڑ ہے۔ دوسرے مجھے ایک باقاعدگی اور ترتیب چاہیئے زندگی میں ۔۔۔۔ اختلاج کا مریض ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دل کی لگاتار دھکڑ پکڑ ۔۔۔۔ بہت جلدی پارہ چڑھ جاتا ہے اور ذرا سی بات میں وحشت ہونے لگتی ہے ۔۔۔ اس گھڑی بھی ہونٹ لرز رہے ہیں اور داہنی آنکھ پھڑکے چلے جا رہی ہے ۔۔۔۔۔ مگر بدترین حالت تو نیند کی ہے۔ جیسے ہی بستر پر لیٹتا ہوں اور نیند آنے لگتی ہے، تو اچانک بائیں طرف ایک کچوکہ سا لگتا ہے! اور پھر ایک نہیں بیس بار وہی ہوتا ہے ۔۔۔۔

نتالیا اسٹیپانو ونا (اندر داخل ہوتے ہوئے) اچھا، اچھا تو یہ آپ تشریف رکھتے ہیں اور پاپا بولتے تھے "اندر جاؤ۔ ایک بیوپاری اپنا مال لینے آیا ہے" ہیلو، ایوان ویسیلیئے وِچ!

لوموف۔ کیا حال چال ہیں، نتالیا اسٹیپانو ونا!

نتالیا اسٹیپانو ونا۔ بھئی معاف کر دینا، میں ایسے ہی ایپرن باندھے باندھے بے پروائی سے چلی آئی ۔۔۔۔ ۔۔۔۔ ہم لوگ سکھانے کے واسطے مٹر کے دانے نکال رہے ہیں۔ اتنے دنوں سے آئے کیوں نہیں تھے؟ بیٹھ جاؤ آرام سے ۔۔۔۔ (دونوں بیٹھ جاتے ہیں) کھانا لگاؤں تمہارے لیے؟

لوموف۔ نہیں، بہت بہت شکریہ، میں ابھی کھا کر ہی آ رہا ہوں۔

نتالیا اسٹیپانو ونا۔ اچھا سگریٹ پی لو ۔۔۔۔ یہ رہا سگریٹ کا بکس ۔۔۔۔ موسم بڑا شاندار ہو رہا ہے، مگر کل بارش اتنی زور کی ہوئی کہ تمام دن مزدوروں کو خالی بیٹھنا پڑا۔ تم نے اب تک چری کتنی نکالی ہے؟ پتہ ہے میرے کو اتنا لالچ آیا ہے، میں نے چری کا پورا کھیت ان لوگوں سے کٹوا ڈالا، اور بعد میں سوچا تو گھبراہٹ

کو کیا ہوا.....

نتالیا۔ اور تمہارا الو کی دم ہمپر ــــ ابا اسے تو مارنے کی بھی ضرورت نہیں۔ بچارہ ویسے ہی ادھ مرا ہو رہا ہے!

لوموف۔ (چیختا ہے) چپ ہو جاؤ! میرا دل پھٹا جا رہا ہے!

نتالیا۔ میں نہیں ہونے کی!

کو.بوکوف۔ (اندر آتے ہوئے) اب کیا ہے؟

نتالیا۔ پاپا، سچ سچ بتایئے گا، بالکل دل سے۔ کون سا کتا اچھا ہے۔ ہمارا اپیر یا ان کا ہمپر؟

لوموف۔ استیپان استیپانووِچ، میں تم سے التجا کرتا ہوں، بس ایک بات بتا دینا: تمہارا ہمپر نشانے سے آگے جانے والا ہے یا نہیں ہے؟ ہاں یا نہیں میں جواب؟

کو.بوکوف۔ اچھا مان لیا کہ ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بھئی اس سے اچھا کتا اس وقت پورے ضلع میں نہیں ہے، خرافات،

لوموف۔ لیکن میرا ہمپر اس سے اچھا نہیں ہے کیا؟ سچ سچ کہہ دینا!

کو.بوکوف۔ اتنا جوش میں مت آؤ، برخوردار..... میں بتاتا ہوں..... تمہارے ہمپر میں، واقعی، بعض خوبیاں ہیں، اصل نسل ہے، دوڑ کا پکا ہے، جاندار ہے، مگر برخوردار، اگر تم اپنے کتے کے بارے میں واقعی سچی بات جاننا چاہتے ہو، تو بھئی، اس میں دو بڑی خامیاں ہیں: ایک تو وہ بڈھا ہے اور دوسرے ناک چپٹی ہے اس کی۔

لوموف۔ معاف کرنا، مجھے اختلاج ہو رہا ہے..... اچھا ایک نظر ذرا حقیقی واقعات پر ڈالیں..... تمہیں یاد ہوگا وہ مارسکن کے کھیتوں میں میرا ہمپر کاونٹ کے ایو نجر کی گردن سے گردن ملا کر دوڑا تھا جبکہ تمہارا ہمپر آدھے میل پیچھے رہ گیا تھا،

کو.بوکوف۔ پیچھے تو یوں رہ گیا تھا کاونٹ کے ملازم نے اس کو چابک مار دیا تھا۔

لوموف۔ وہ تو لگنا ہی چاہیئے تھا۔ تمام کتے تو لومڑی کو گھیر رہے تھے اور ہمپر نے بھیڑ کے ساتھ چھیڑ خانی شروع کر دی۔

کو.بوکوف۔ یہ غلط ہے!..... برخوردار، میرا غصہ بہت خراب ہے اس لیے میں تم سے کہہ رہا ہوں اس حجت بازی کو یہیں ختم کر دو۔ اس کو مارا اس لیے گیا تھا چونکہ ہر ایک آدمی دوسروں کے کتوں سے خار کھاتا ہے..... جی ہاں! سب کے سب نفرت کرتے ہیں! اور آپ جناب پر بھی یہی الزام آ سکتا ہے! بس جیسے ہی تم کو پتہ لگتا ہے کہ کوئی کتا ہمپر سے اچھا ہے اور کوئی نہ کوئی بات شروع..... خرافات..... سمجھے، مجھے ساری بات یاد رہتی ہے!

لوموف۔ اور مجھے بھی!

کوبوکوف۔ (اس کی نقل اتارتا ہے) اور مجھے بھی! ہاں کیا بات یاد ہے تم کو؟

لوموف۔ اختلاج..... میرا پاؤں سن ہو گیا..... میں تو...

نتالیا۔ (اس کی نقل اتارتی ہے) اختلاج!..... کس وضع کے شکاری ہو تم؟ تم تو آرام سے باورچی خانہ میں لیٹو اور کاکروچ مارا کرو..... لومڑیوں کے شکار کو مت نکل جانا! میاں اختلاج!

کوبوکوف۔ واقعی، کون سی وضع کے شکاری ہو تم؟ تم کو تو اپنے اختلاج کو لیکر گھر پر بیٹھے رہنا چاہیئے، بجائے اس کے کہ گھوڑے پر لٹکے لٹکے پھرو۔ آدمی شکار کی نیت سے جاتے تو بڑی اچھی بات ہے، مگر تم تو اس لیے جاتے ہو کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ حجت بازی کا موقع ملے اور دوسروں کے کتوں کو پریشان کر دیا اور کچھ خرافات..... مجھے بڑی جلدی غصہ آ جاتا ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس بات چیت کو یہیں ختم کر دیا جائے! تم تو اصل معنوں میں شکاری ہی نہیں ہو، بس ختم ہوئی بات!

لوموف۔ اور تم بڑے شکاری ہو؟ تم شکار کھیلنے کیا جاتے ہو کاونٹ کو مسکہ لگانے جاتے ہو اور سانٹھ گانٹھ پھیلانے..... اختلاج! تم فتنہ پرور ہو!

کوبوکوف۔ کیا؟ فتنہ پرور (چلاتا ہے) ابے چوپ!

لوموف۔ فتنہ پرور!

کو.بوکوف۔ نالی کا کیڑا! کتے کا پلا!

لوموف۔ کھوسٹ چوہے! تاویل باز!

کوبوکوف۔ چپ ہو جا، نہیں تو میں تجھکو کباڑی کی بندوق سے تیتر کی طرح گرا دوں گا! پلپلے!

لوموف۔ بچہ بچہ جانتا ہے ـــ ارے میرا دل! وہ تمہاری غریب مرحومہ بیوی تمہاری پٹائی کیا کرتی تھی..... میری ٹانگ..... میرا ماتھا..... میری آنکھوں کے سامنے تارے..... میں گر رہا ہوں! میں گرا جا رہا ہوں! (آرام کرسی میں ڈھیر ہو جاتا ہے)

لومڑی کے شکار پر جاؤں گا، پیاری نتالیا اسٹیپانوونا مگر سنا تم نے ؟ تم سوچ بھی نہیں سکتیں میرے اوپر کیا مصیبت آکر پڑ رہی ہے! میرا کتا ہمپر — تم تو جانتی ہو اس کو — اس نے لنگڑانا شروع کر دیا۔

نتالیا ۔ بڑا افسوس ہوا سن کر! کیوں ؟

لوموف۔ پتہ نہیں ...... اس کے پنجہ کی ہڈی چوٹ کھا گئی اور ایک دوسرے کتے نے اسے کاٹ بھی کھایا۔ (ٹھنڈی سانس لیتا ہے) روپیہ کی بات تو خیر چھوڑو، میرا سب سے بڑھیا کتا وہی ہے۔ مرنوف کو اس کے لیے پورے ایک سو پچیس روبل گن کر دئیے تھے۔

نتالیا۔ تم نے زیادہ قیمت دے دی، ایوان وسیلیئے وچ!

لوموف۔ بھئی، میرے خیال میں تو، کافی سستا پڑا تھا۔ بڑے کمال کا کتا ہے۔

نتالیا ۔ پاپا نے یمپر کے لیے پچاسی روبل خرچ کیے تھے اور یمپر بہر حال ہمپر سے کہیں اچھا ہے۔

لوموف۔ یمپر اچھا ہے ہمپر سے ؟ مذاق کر رہی ہو تم! (ہنستا ہے) بھئی واہ، یمپر اچھا ہو گیا ہمپر سے!

نتالیا ۔ بالکل اچھا ہے اس سے! ٹھیک ہے۔ یمپر جوان ہے، بلکہ دیکھا جائے تو ابھی پورا بڑھا بھی نہیں ہے، مگر بہت سی باتوں میں اور نسل کے لحاظ سے وہ کسی بھی والکانیے سکی کتے سے بہتر ہے۔

لوموف۔ معاف کرنا، نتالیا اسٹیپانوونا، تم شاید یہ بھول گئیں کہ وہ نشانے سے آگے جاتا ہے اور ایسا کتا شکار کو اچھی طرح دبوچ نہیں سکتا۔

نتالیا ۔ نشانے سے آگے جاتا ہے ؟ یہ پہلی بار میں نے کسی کے منہ سے سنا ہے!

لوموف۔ میری بات مان لو، اس کا نچلا جبڑا اوپر والے سے چھوٹا ہے۔

نتالیا۔ تم نے ناپا ہے اس کو ؟

لوموف۔ ہاں، ناپا ہے میں نے۔ پیچھا کرنے کے واسطے وہ واقعی ٹھیک ہے، مگر جہاں دبوچنے کا سوال آیا، تو پھر مشکل سے ہی وہ ......

نتالیا ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا یمپر اصل نسل ہے۔ وہ ہارنیس اور خرپس کی اولاد ہے اور تمہارے کتے کی نسل کے بارے میں ہم نے کبھی کچھ نہیں سنا ...... وہ بڈھا اور بدصورت ہے چڑیل کی شکل کا۔

لوموف۔ وہ بڈھا ہے، مگر میں اس کے بدلے میں تمہارے یمپر جیسے پانچ کتے بھی نہ لوں۔ واقعی، کیسے لے سکتا ہے کوئی ؟ ہمپر کتا ہے مگر یمپر ...... اس کے بارے میں تو دلیل بازی کرنا بھی ہنسی اڑوانا ہے ..... ہر ایک شکاری کے پاس یمپر ہے۔ اس طرح کے کتے سستے ہیں اور آسانی سے مل بھی جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو پچیس روبل کی رقم بھی زیادہ ہے۔

نتالیا ۔ ایوان وسیلیئے وچ، آج کے دن تو شاید شیطان تمہارے کان میں پھونک گیا ہے کہ ہر ایک بات کو کاٹنا ضرور، پہلے تو تم ایک کہانی گھڑ کے لائے کہ وولوئی چراگاہیں تمہاری ہیں اور اب اس بات پر تلے ہو کہ ہمپر یمپر سے زیادہ اچھا ہے۔ مجھے یہ ذرا نہیں اچھا لگتا کہ مطلب کچھ ہے اور منہ سے بات کچھ کہی جا رہی ہے اب دیکھو، تم خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ یمپر ہزار درجہ بہتر ہے ...... اس کمبخت مارے تمہارے ہمپر سے تو پھر آخر اس کا الٹا کیوں کہے چلے جا رہے ہو ؟

لوموف۔ میرے خیال میں، نتالیا اسٹیپانوونا، تم مجھے آنکھوں کا اندھا سمجھتی ہو یا پھر عقل سے خارج اتنی سی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتیں یمپر نشانے سے آگے جانے والا کتا ہے!

نتالیا ۔ یہ بات درست نہیں ہے۔

لوموف۔ وہ ہے بھئی!

نتالیا ۔ (چلاتی ہے) وہ نہیں ہے!

لوموف۔ آپ چلا کیوں رہی ہیں، محترمہ ؟

نتالیا ۔ بکواس کرنے سے کیا حاصل ہے ؟ بے ہودگی کی انتہا ہے۔ تمہارا ہمپر گولی مار دینے لائق ہے ؟ اور تم مقابلہ کر رہے ہو اس کا یمپر سے!

لوموف۔ معاف کرنا، میں اس بحث کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ مجھے اختلاج ہو رہا ہے۔

نتالیا ۔ میں نے تجربہ سے دیکھا ہے وہ شکاری جو سب سے زیادہ بحث کرتے ہیں سب سے کم جانتے ہیں چیزوں کو

لوموف۔ محترمہ، میں آپ کی منت کرتا ہوں ؟ خاموش رہئے .... میرا دل پھٹا جا رہا ہے ...... (چلاتا ہے) چپ ہو جاؤ!

نتالیا ۔ میں تب تک چپ نہیں ہونے کی جب تک تم یہ نہ تسلیم کر لو کہ یمپر ہمپر سے ہزار درجہ بہتر ہے!

لوموف۔ ہزار درجہ بدتر ہے! تمہارا یمپر مر جائے تو اچھا ہے! ارے، میری کن پٹیاں، میری آنکھیں، میرے شانوں

کو.بوکوف ۔ (پیچھے سے چلاتا ہے) اور خبردار جو اس گھر میں
دوبارہ پاؤں رکھا تم نے!
نتالیا ۔ اب عدالت میں ہی لے جانا اس معاملے کو! ہم بھی
تو دیکھیں گے! (لوموف لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل
جاتا ہے)
کو.بوکوف. بدمعاش! کھسیانا کوا!
نتالیا ۔ راکھشس کہیں کا! دوسروں کی زمین ہتھیا رہا ہے،
اور پھر ساتھ میں ہماری بے عزتی بھی کر رہا ہے!
کو.بوکوف. لعنت زدہ لڑکا، مجنجو کہیں کا، یعنی ہمت دیکھئے
شادی کا پیغام پیش کرنے آئے تھے، خرافات! تم
کو تو یقین بھی نہیں آئے گا، بھئی واہ پیغام کی خوب
رہی!
نتالیا ۔ کیسا شادی کا پیغام؟
کو.بوکوف. ذرا سوچو! وہ یہاں تمہارا رشتہ مانگنے آیا تھا۔
نتالیا ۔ رشتہ؟ میرے سے؟ یہ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں
بتایا؟
کو.بوکوف. ارے اسی لیے تو وہ حضرت شام کے لباس میں
بن ٹھن کر آئے تھے! سور کہیں کا! جھینگا مچھلی کی
اولاد!
نتالیا ۔ میرے سے؟ رشتہ؟ (آرام کرسی میں ڈھیر ہو
جاتی ہے اور سسکیاں لیتی ہے) اسے واپس بلائیے!
اسے واپس بلائیے! ہائے رے! اسے واپس بلائیے!
اسے بلا کر لائیے واپس!
کو.بوکوف. کس کو بلاؤں واپس؟
نتالیا ۔ جلدی! جلدی! مجھے غش آ رہا ہے! اسے واپس
بلائیے! ہائے ہائے! (گویا دورہ پڑ رہا ہے)
کو.بوکوف. مطلب کیا ہے تمہارا؟ تم کو ہو کیا گیا ہے؟ دونوں
ہاتھوں سے سر جکڑ لیتا ہے) میں بھی کیا بدنصیب
آدمی ہوں! میں گولی مار لوں گا اپنے! پھندا ڈال
کے لٹک جاؤں گا! یہ تو گودے ڈال رہے ہیں
مجھے!
نتالیا ۔ ہائے میرا دم نکل رہا ہے! اسے واپس بلائیے!
کو.بوکوف. فووو! ایک منٹ میں تو۔ گلا مت پھاڑو! (باہر
جست لگاتا ہے)
نتالیا ۔ (تنہا، سسکیاں لیتی ہے) ہائے یہ ہم نے کیا کر ڈالا!
اسے واپس بلائیے! اسے واپس بلائیے!
کو.بوکوف. (بھاگتا ہوا اندر آتا ہے) وہ آ رہا ہے خرافات،
لعنت ہے اس پر! اووف! تم ہی خود اس سے بات
کرنا، میں بالکل نہیں چاہتا کہ ....
نتالیا ۔ (سسکیاں لیتے ہوئے) اسے واپس بلائیے!
کو.بوکوف. (دہاڑتا ہے) دم مت نکال اپنا، وہ آ رہا ہے! میں
بتا تو رہا ہوں۔ کیا لعنت زدہ بوجھ ہے، یا اللہ! جوان
لڑکی کا باپ ہونا بھی! میں گلا کاٹ لوں گا اپنا! دیکھتی
رہنا، کاٹ لوں گا میں گلا اپنا! ہم نے لڑکے کی بے عزتی
کی، پانی پانی کیا اسے، دھکے دیکر باہر نکالا، اور یہ سب
تمہارا کیا دھرا ہے! .... تمہارا!
نتالیا ۔ نہیں، آپ نے کیا سب!
کو.بوکوف. اچھا تو یہ میری خطا ہے، اور کیا امید ہے! دروازے
پر لوموف نظر آتا ہے) ٹھیک ہے، تم خود ہی بات
کرو اس سے! (باہر چلا جاتا ہے)
لوموف. (اندر داخل ہوتا ہے، تھکا ہارا) بڑا سخت اختلاج
ہو رہا ہے ..... میرا پاؤں سو گیا ہے .....
پہلو میں لہر سی اٹھ رہی ہے .....
نتالیا ۔ ہمیں معاف کر دینا، ہم نے اچھی خاصی جلد بازی
سے کام لیا، ایوان ویسیلیئے ویچ ..... اب
مجھے یاد آیا: وولوئی چراگاہیں واقعی تمہاری ہی ہیں۔
لوموف. میرا دل بڑی تیز دھک دھک کر رہا ہے .....
میری چراگاہیں ..... میری دونوں آنکھوں کے پپوٹے
پھڑک رہے ہیں .....
نتالیا ۔ ہاں ہاں، وہ تمہاری ہیں، چراگاہیں تمہاری ہیں ...
بیٹھ جاؤ نا ..... (دونوں بیٹھتے ہیں) ہم دراصل غلطی
پر تھے۔
لوموف. میرے واسطے، وہ اصول کا سوال تھا ــــ وہ زمین
ایسی نہیں ہے کہ میں اس کی پروا کرتا پھروں، بس اصول
کا سوال تھا۔
نتالیا ۔ اصول کا ہی تو ..... چھوڑو کوئی اور بات کریں۔
لوموف. خاص طور پر، جبکہ میرے پاس ثبوت بھی ہے۔ میری خالہ
کی دادی صاحبہ نے تمہارے والد کے دادا صاحب کے
کسانوں کو دی تھیں .....
نتالیا ۔ کافی ہے، بہت ہو لیا، قصہ ختم ..... (علیحدہ) سمجھ میں
نہیں آ رہا اس کو اس معاملے پر کیسے شروع کرایا جائے
..... (اس سے) کیا تم شکار پر آج کل میں ہی جانے
والے ہو؟
لوموف. میں نے سوچا یہ ہے کہ فصل کی کٹائی ختم ہونے تو

کتا بھی جانتا ہے کہ وہ ہماری ہے، ختم ہوئی بات۔
اب اس میں تم ساز شیں تو تلاش کر نہیں سکتے!
لوموف۔ میں آپ کے سامنے ثابت کر دونگا وہ میری ہیں!
کوبوکوف۔ تم ثابت نہیں کر سکوگے، برخوردار!
لوموف۔ ہاں ہاں، میں کر کے رہوں گا!
کوبوکوف۔ اس طرح چلانے کی کیا ضرورت ہے، میرے عزیز؛ چیخنے چلانے سے ثابت کچھ نہیں ہو جاتا! میں ہر چند تمہاری چیز کا خواستگار نہیں ہوں مگر ساتھ ہی اس پر بھی نظر رکھنا چاہتا ہوں کہ کوئی صاحب میری بھی کوئی چیز نہ لے بھاگیں۔ میری طبیعت اور طرح کی ہے۔ اب جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے، برخوردار، اگر تم ان چراگاہوں کو جھگڑے میں ڈالنا چاہتے ہو، تو میں تمہیں دینے کی بجائے کسانوں کے پاس ان کا جانا کہیں بہتر سمجھوں گا۔ سمجھ میں آیا آپ کی!
لوموف۔ بڑی حیرت کی بات ہے! آپ کو غیر کی زمین کسی کو بخشنے کا کیا حق ہے؟
کوبوکوف۔ جناب والا ہی ارشاد فرمائیں مجھے حق ہے یا نہیں۔ میاں لڑکے، دھیان دے کر سنو، میں اس طرح کا لہجہ سننے کا عادی نہیں ہوں، خرافات، میں تم سے دوگنی عمر کا ہوں، میاں لڑکے، اور میں بتائے دیتا ہوں مجھ سے رسان میں بات کرنا۔
لوموف۔ نہیں، نہیں! تم مجھے چغد سمجھتے ہو، میرا مذاق بنا رہے ہو! ایک تو میری زمین کو اپنا بتا رہے ہو اور پھر چاہتے ہو میں خاموش رہ جاؤں اور ایسے بات کروں جیسے آپ بڑے شریف آدمی ہیں! اچھے پڑوسیوں کے یہ طور طریق تو نہیں ہوتے، اسٹیپان اسٹیپانچ! میں بتائے دیتا ہوں تم پڑوسی نہیں ہو، غاصب ہو غاصب!
کوبوکوف۔ کیا ہوا؟ کیا کہا تم نے مجھے؟
نتالیا۔ پاپا چراگاہوں پر گھاس کاٹنے والی مشین فوراً بھیج دیجئے نا!
کوبوکوف۔ (لوموف سے) کیا فرمایا تھا، جناب والا نے؟
نتالیا۔ وولوئی چراگاہیں ہماری ہیں، اور میں انہیں جانے نہیں دوں گی، بالکل نہیں، برابر بھی نہیں!
لوموف۔ ہم دیکھیں گے! میں عدالت میں ثابت کر دوں گا وہ میری ہیں!
کوبوکوف۔ عدالت میں! آپ ضرور اسے عدالت میں لے جائیں

بندہ پرور! شاباش، رکنا نہیں! میں جانتا ہوں تمھیں ___ تم تو عدالت میں جانے کی راہ ہی دیکھ رہے ہو، خرافات ..... تمہاری تو فطرت میں فساد داخل ہے! اور تم کیا، تمہارا سارا خاندان مقدمہ باز ہے! الف سے یکری تک!
لوموف۔ مہربانی فرما کر میرے خاندان کو نہ کھائیں! لوموف گھرانا ہمیشہ کا ایمان دار مشہور ہے۔ ان کے یہاں کسی پر کبھی کوئی غبن کا مقدمہ نہیں چلا، آپ کے پیارے چچا کی طرح سے!
کوبوکوف۔ اور تمہارا لوموف خاندان ___ پورا خاندان پاگلوں سے بھرا پڑا ہے!
نتالیا۔ سب کے سب! الف سے یی تک!
کوبوکوف۔ تمہارے دادا خبط الحواس تھے اور وہ تمہاری سب سے چھوٹی پھوپھی، نستاسیا مخائیلو ونا، ایک نقشہ نویس کے ساتھ فرار ہو گئی تھی، اور ایسی ہی خرافاتیں ...
لوموف۔ اور تمہاری ماں تو کبڑی تھی (اپنا دل جکڑ لیتا ہے) پہلو میں ایک لہر سی اٹھی ہے ..... اب سر میں اٹھ رہی! یا اللہ! پانی!
کوبوکوف۔ اور تمہارا باپ جواری تھا پرلے سرے کا اور اول درجہ کا کھاؤ پیر تھا!
نتالیا۔ اور وہ تمہاری پھوپھی، زمانے بھر میں جھوٹی خبریں اڑاتی پھرتی تھی ___ اس کا تو ثانی ہی پیدا ہونا مشکل ہے!
لوموف۔ میرا بایاں پاؤں سُن ہو گیا ..... اور تم .... دنیا بھر میں سانٹھ گانٹھ کرتی پھرتی ہو .... اف میرا دل! اور یہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے ___ پچھلے الیکشن سے پہلے .... آنکھوں کے سامنے تارے آرہے ہیں .... میرا ہیٹ کہاں ہے؟
نتالیا۔ بڑی کمینی حرکت ہے! بے ایمانی کی حد ہے! تھو ہے!
کوبوکوف۔ اور تم زہریلے ناگ ہو، دو پھن والی دومونہی! یہ ہے تمہاری اصلیت۔
لوموف۔ یہ مل گیا میرا ہیٹ ..... میرا دل ___ کس راستے پر چل پڑا میں؟ دروازہ کہاں ہے؟ ہائے رے! .... میرا خیال ہے میری موت ہو جانے والی ہے! ... میرا پاؤں سُن ہے۔ (دروازے کی جانب جاتا ہے)

سوروبل کی ... مگر ناانصافی کی بات پر مجھے بڑی نفرت آتی ہے۔ تمہارا پتہ نہیں، مگر ناانصافی مجھ سے تو برداشت ہوتی نہیں۔

لوموف۔ سنو تو سہی، میری بات تو سنو! تمہارے پر دادا کے کسان، جیسا میں نے ابھی عرض کیا، میری خالہ کی دادی صاحبہ کی اینٹیں پکاتے تھے۔ اس پر میری خالہ کی دادی صاحبہ نے سوچا کہ بھئی ان لوگوں کی راحت کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست .....

نتالیا۔ دادا، ابا، دادی صاحبہ، خالہ .... مجھے تو اس کہانی کے سر پیر کا ہی پتہ نہیں چل رہا! چراگاہیں ہماری ہیں، قصہ ختم ہوا!

لوموف۔ میری ہیں!

نتالیا۔ ہماری ہیں! تم چاہے دو مہینے اسے ثابت کرنے پر لگے رہو، ایک نہیں اٹھارہ سوٹ پہن کر آجاؤ، مگر میں بتائے دیتی ہوں وہ ہماری ہیں، ہماری ہیں، ہماری ہیں! ..... مجھے تمہاری اتنی سی چیز نہیں چاہیئے مگر اپنی کوئی چیز میں خواہ مخواہ گنوانا بھی نہیں چاہتی .... آپ اپنا دل خوش کرتے رہیں!

لوموف۔ مجھے چراگاہوں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ نتالیا استیپانوونا، مگر اس میں اصول کی ذرا سی بات ہے اگر تم چاہو، تو میں تم کو وہ بطور تحفہ دے سکتا ہوں

نتالیا۔ میں خود تم کو وہ بطور تحفہ دے سکتی ہوں۔ کیونکہ وہ میری ہیں! ..... بڑی حیرت کی بات ہے، ایوان ویسیلیئے وچ! اب اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہم تو اب تک تم کو بڑا اچھا پڑوسی سمجھتے رہے ہیں، کہ بھئی دوست ہیں اپنے! پچھلے سال کی بات ہے ہم نے تم کو بھوسہ نکالنے کی اپنی مشین دی تھی، حالانکہ اس کی وجہ سے ہم کو اپنا کام نومبر تک ٹالنا پڑا تھا۔ اور تم ہم کو سمجھ رہے ہو جیسے کہیں سے خانہ بدوش آپڑے ہیں! میری ہی زمین مجھ کو بخشی جا رہی ہے۔ واہ بھئی واہ! معاف کرنا، مگر یہ پڑوسیوں والی باتیں نہیں ہیں! بلکہ مجھ سے پوچھو تو، یہ خاصی بیہودگی ہے، اگر تم یہ سمجھنا چاہتے ہو .....

لوموف۔ تو پھر آپ کے خیال سے تو میں غاصب ہوا! محترمہ میں نے آج تک کسی کی زمین نہیں دبائی اور میں کسی کو اجازت بھی نہیں دوں گا کہ وہ اس طرح کے الزام میری ذات پر تھوپے .... (لپک کر الماری کی جانب جاتا اور پانی پیتا ہے) وولوئی چراگاہیں میری ہیں!

نتالیا۔ یہ سراسر غلط ہے۔ وہ ہماری ہیں!

لوموف۔ وہ میری ہیں!

نتالیا۔ سراسر غلط! میں ثابت کر کے دکھا دوں گی! آج ہی گھاس کاٹنے کی مشین چراگاہوں پر بھیج دیتی ہوں!

لوموف۔ کیا کہا؟

نتالیا۔ میرے آدمی آج ہی وہاں پہونچ جائیں گے!

لوموف۔ میں ان کو چھٹی کا کھایا یاد دلا دوں گا!

نتالیا۔ تمہاری مجال نہیں ہے اتنی!

لوموف۔ (اپنا سر تھام لیتا ہے) وولوئی چراگاہیں میری ہیں! سمجھیں آپ! تمہاری؟ میری ہیں!

نتالیا۔ مہربانی کر کے، چلایئے نہیں! اپنے گھر میں بیٹھ کر خوب گلا پھاڑو، مگر میں کہے دیتی ہوں یہاں پر قاعدے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے!

لوموف۔ اگر یہ کمبخت اختلاج نہ ہوتا اور کنپٹیوں میں پھڑکن نہ ہوتی، محترمہ، تو میں تم سے دوسری طرح بات کرتا! (چلاتا ہے) وولوئی چراگاہیں میری ہیں!

نتالیا۔ ہماری ہیں!

لوموف۔ میری ہیں!

نتالیا۔ ہماری ہیں!

لوموف۔ میری ہیں!

کوبوکوف۔ (اندر داخل ہوتے ہوتے) کیا قصہ ہے بھئی؟ کس بات پر اتنا چلایا جا رہا ہے؟

نتالیا۔ پاپا، ذرا ان صاحب کو سمجھایئے وولوئی چراگاہیں، کس کی ہیں، ہماری ہیں یا ان کی!

کوبوکوف۔ (لوموف سے) چراگاہیں تو ہماری ہیں، عزیز من!

لوموف۔ معاف کیجئے گا، استیپان ، وہ آپ کی کیسے ہو سکتی ہیں؟ ایمانداری کی بات ہونی چاہیئے میری خالہ کی دادی صاحبہ نے چراگاہیں تمہارے کسانوں کو عارضی طور پر بغیر کرایہ دی تھیں۔ کسانوں نے زمین چالیس برس تک استعمال کی اور استعمال کرتے کرتے ان کو ایسی عادت پڑی کہ اس کو اپنی ہی ملکیت سمجھنے لگے، اب جب وقت آیا ...

کوبوکوف۔ معاف کرنا، پیارے دوست ..... تم یہ بھول رہے ہو کیا کسانوں نے تمہاری دادی صاحبہ کو کو صرف اس وجہ سے ادائیگی نہیں کی تھی کہ وہ زمین جھگڑے کی تھی یا اور کوئی چکر۔ میاں اس علاقہ کا

بھی ہوئی! خطرہ یہ ہے کہ چری پڑے پڑے سڑنے نہ لگے۔ میرے خیال میں کٹائی کے معاملے میں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ مگر یہ کیا قصہ ہے؟ اخاہ، شام کے لباس میں ہو باقاعدہ؟ یا حیرت، یا نصیب! بال ڈانس وغیرہ کے لیے جا رہے ہو کیا! میرے خیال میں اس میں قدرے بہتر لگ رہے ہو، بہر حال.... سچ بتاؤ آج چھیلا کیوں بنے ہو؟

لوموف۔ (پُرجوش) دیکھو عزیزہ من نتالیا اسٹیپانوونا..... حقیقت یہ ہے، میں نے پکا ارادہ کیا ہے کہ تم کو اپنی بات سنا کر رہوں گا.... واقعی تم کو بڑا تعجب ہوگا اور ہو سکتا ہے غصہ بھی آجائے مگر میں... (علیحدہ) غضب کی ٹھنڈک ہے بھئی!

نتالیا اسٹیپانوونا۔ اچھا بات کیا ہے! (وقفہ) ہوں؟

لوموف۔ میں مختصر کرنے کی کوشش کروں گا، نتالیا اسٹیپانوونا بڑی مدت پہلے سے سمجھو بچپن سے ہی، یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تمہارے خاندان کے ساتھ شناسائی رہی ہے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے میری خالہ اور ان کے شوہر جن سے، تمہیں معلوم ہے مجھے یہ سب ترکہ ملا ہے، ہمیشہ تمہارے والد اور تمہاری مرحومہ والدہ کی بے انتہا عزت کرتے رہے ہیں۔ لوموف خاندان اور چوبوکوف گھرانے کے درمیان بے حد دوستی رہی ہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ نہایت قریبی تعلقات رہے ہیں۔ اور تم کو معلوم ہی ہے کہ میری زمین بھی تمہارے بالکل قریب کی ہے۔ وہ میری وولوئی چراگاہیں تمہارے ڈھاک کے جنگل سے ملی ہوئی ہیں۔

نتالیا اسٹیپانوونا۔ معاف کرنا، قطع کلام ہوتا ہے۔ کیا کہا تم نے "میری وولوئی چراگاہیں".... کیا واقعی وہ تمہاری ہی ہیں؟

لوموف۔ ہاں میری....

نتالیا۔ اچھا کمال ہے! وولوئی چراگاہیں ہماری ہیں، تمہاری نہیں!

لوموف۔ نہیں بھئی، وہ تو میری ہیں نتالیا اسٹیپانوونا۔

نتالیا۔ یہ اچھی سنائی۔ تمہاری کب سے ہو گئیں وہ؟

لوموف۔ اس کا کیا مطلب ہوا، یعنی؟ میں تو وولوئی چراگاہوں کی بات کر رہا تھا جو تمہارے والے ڈھاک کے جنگل اور دلدل کے درمیان میں ہیں۔

نتالیا۔ ہاں ہاں، ٹھیک ہے..... مگر وہ ہماری ہیں۔

لوموف۔ نہیں بھئی، تمہیں مغالطہ ہو رہا ہے، نتالیا اسٹیپانوونا محترمہ وہ میری ہی ہیں۔

نتالیا۔ اجی ہوش کی دوا کرو، ایوان ویسیلئے وچ! وہ کس دن سے تمہاری ہوئیں؟

لوموف۔ کس دن سے، تمہارا کیا مطلب ہے! جہاں تک بھی مجھے یاد پڑتا ہے وہ ہماری ہی چلی آرہی ہیں۔

نتالیا۔ بھئی، معاف کرنا اس معاملے میں میرا خیال تم سے الگ ہے۔

لوموف۔ تم کاغذات میں دیکھ لو، نتالیا اسٹیپانوونا۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک زمانے میں وولوئی چراگاہیں جھگڑے میں پڑ گئیں تھیں، مگر اب تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ وہ میری ہیں۔ دیکھا جائے تو اس میں بحث تکرار کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ دیکھو، میں بتاتا ہوں ساری بات ——— میری خالہ کی دادی صاحبہ نے تمہارے پردادا کے کسانوں کو مویشی چرانے کے واسطے وہ چراگاہیں دی تھیں۔ کرایہ وغیرہ کچھ نہیں، یہ بھی طے نہیں تھا کہ بھئی کتنی مدت کو۔ معاوضہ یہ ٹھہرا تھا کہ وہ لوگ ان کو اینٹیں پکا کر دیں گے۔ تمہارے پردادا کے کسانوں نے ان کو چالیس سال تک مفت استعمال کیا۔ اور کرتے کرتے ان کو اپنی ملکیت ہی سمجھنے لگے.... پھر اس کے بعد معاملہ دوبارہ سے طے ہو گیا....

نتالیا۔ مگر جیسا تم نے کہہ دیا ساری بات ایسے ہی تو نہیں تھی! میرے دادا اور پردادا دونوں ہی سمجھتے تھے کہ ان کی زمینیں دلدل تک ہیں ——— تو ظاہر ہے وولوئی چراگاہیں ہماری ہی ہوں گی۔ اب اس میں تکرار کی کہاں گنجائش ہے؟ میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آرہی۔ یہ تو خوامخواہ غصہ دلانے والی بات ہے!

لوموف۔ میں تمہیں کاغذات دکھا دوں گا، نتالیا اسٹیپانوونا!

نتالیا۔ تم مذاق کر رہے ہو یا پھر مجھے چھیڑنے کے لئے کہہ رہے ہو.... کمال ہے! یعنی تین سو سال سے ایک زمین ہماری ملکیت میں ہو اور اب اچانک ہم کو یہ بتایا جائے کہ وہ ہماری نہیں ہے! ایوان ویسیلئے وچ، یعنی مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا ہے.... ویسے میری نظر میں ان چراگاہوں کی کوئی خاص قیمت نہیں ہے۔ تیرہ سوا تیرہ ایکڑ زمین ہوگی، مطلب کوئی تین

ڈاکٹر ازغش کھاجاتا ہے)

کوبوکوف۔ نالی کا کیڑا! منچھو! پلپلا! مجھے غش آرہا ہے (پانی پیتا ہے) غش!

نتالیا۔ کون سی وضع کے شکاری ہو تم؟ تمہارے بس کا تو گھوڑے پر بیٹھنا بھی نہیں ہے! (اپنے باپ سے) پاپا! (چیخ مارتی ہے) ایوان ویسیا لیئے وِچ! یہ تو مرگیا!

کوبوکوف۔ مجھے غش آتا جارہا ہے! میرا دم گھٹ رہا ہے! ہوا!

نتالیا۔ یہ تو مرگیا! (لوموف کی آستین سے چمٹ جاتی ہے) ایوان ویسیا لیئے وِچ! ایوان ویسیا لیئے وِچ! ہم نے کیا کر ڈالا! یہ تو مرگیا! (ایک آرام کرسی میں ڈھیر ہوجاتی ہے) ڈاکٹر! ڈاکٹر! (دیوانہ وار چیخیں)

کوبوکوف۔ ہائیں! اب کیا ہے؟ اب تمہیں کیا ہوا ہے؟

نتالیا۔ (سسکی لیتی ہے) یہ مرگیا...... مرگیا!

کوبوکوف۔ کون مرگیا؟ (لوموف کو تاکتے ہوئے) یہ تو مرگیا! یا اللہ رحم کر! پانی! ڈاکٹر! (پانی کا گلاس لوموف کے منہ سے لگاتا ہے) پی لو! نہیں، یہ نہیں پیئے گا! اس کا مطلب ہے یہ مرگیا، اور کچھ خرافات! میں دنیا کا سب سے زیادہ بدنصیب آدمی ہوں! میں نے اپنا بھیجا گولی سے کیوں نہیں اڑا دیا؟ میں نے اپنا گلا بہت مدت پہلے ہی کیوں نہ کاٹ لیا؟ میں کس بات کے انتظار میں ہوں؟ ارے مجھے کوئی چاقو ہی دے دو! ارے میری بندوق لا دو! (لوموف میں حرکت ہوتی ہے) اس میں سانس آرہا ہے تھوڑا پانی پی لو! ...... یہ بات ہے!

لوموف۔ میری آنکھوں کے آگے چنگاریاں اڑ رہی ہیں...... ایک دھندسی...... میں کہاں ہوں؟

کوبوکوف۔ تم کو جتنی جلدی ہوسکے شادی کرلینی چاہیئے...... شیطان کی مار ہو! اب وہ رضامندی دے رہی ہے! (لوموف اور نتالیا کے ہاتھ ملاتا ہے) اس نے رضامندی دے دی ہے اور باقی سب خرافات بھی میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، اور تمام خرافات۔ بس مجھے چین سے رہنے دو اکیلا!

لوموف۔ ہائیں؟ کیا؟ (اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) کون؟

کوبوکوف۔ اس نے رضامندی دے دی ہے! اچھا، اب تم دونوں ایک دوسرے کو چوم لو...... اور...... جہنم میں چلے جاؤ!

نتالیا۔ (سسکیاں لیتے ہوئے) یہ زندہ ہے...... ہاں، ہاں، میں نے رضامندی دے دی ہے......

کوبوکوف۔ چوم لو ایک دوسرے کو!

لوموف۔ ہائیں؟ کون؟ (نتالیا کو چومتا ہے) میں بہت خوش ہوں...... معاف کرنا کس سلسلے میں ہے یہ سب؟ ارے، ہاں، سمجھ میں آیا، اختلاج، چنگاریاں...... میں خوش ہوں، نتالیا اسٹیپانوونا...... (اس کا ہاتھ چومتا ہے) میری ٹانگ سوگئی ہے......

نتالیا۔ میں...... میں بھی بہت خوش ہوں......

کوبوکوف۔ دماغ سے کس قدر بوجھ اتر گیا ہے!...... اووف!

نتالیا۔ لیکن...... اب تم کو مان ہی لینا چاہیئے: ہمپر اتنا اچھا نہیں جتنا ہمپر ہے،

لوموف۔ وہ بہتر ہے! وہ برتر ہے!

نتالیا۔ بدتر ہے!

کوبوکوف۔ واہ، گرہستی شروع کرنے کا کیا طریقہ نکالا ہے! ہم لوگوں کو تھوڑی شمپین پینی چاہیئے!

لوموف۔ وہ بہتر ہے! برتر ہے!

نتالیا۔ وہ بدتر ہے! بدتر ہے! بدتر ہے!

کوبوکوف۔ (چلا کر دونوں کو چپ کرانا چاہتا ہے) ہم لوگوں کو تھوڑی سی شمپین پینی چاہیئے! شمپین!

—— پردہ ——

• غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے۔
• غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔
• غزل شاعری کا عطر ہے۔
• غزل تہذیب کی معراج ہے۔

غزل اور صنفِ غزل پر بہترین مضامین اور غزلوں کے انتخاب سے مزین ہے۔ چنگاری کا خاص نمبر

غزل نمبر

چنگاری

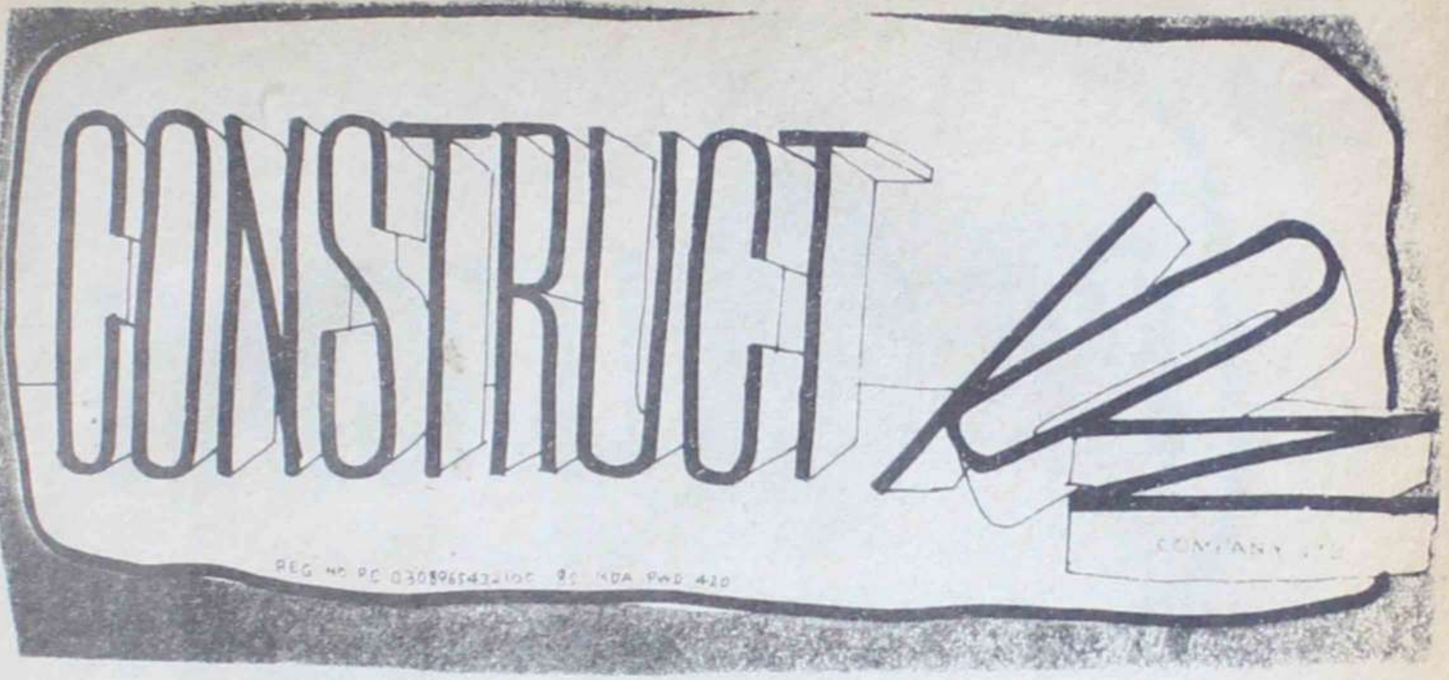
CONSTRUCT
COMPANY

MANH

و میراجی چاہتا تو میں بھی کرشن چندر کی طرح گھٹیا لکھ سکتا تھا۔ (راجندر سنگھ بیدی)۔

و کل کا محسن لاہوری .... آج کا راجندر سنگھ بیدی۔

و ہندوستان سے آنے والی کتابوں کو کسٹم والے روک لیتے ہیں۔

آج کل بھارت سے ہمارے تعلقات بہت بہتر ہو رہے ہیں۔ سرکاری سطح پر مذاکرات کا سلسلہ جاری ہے، تجارتی وفد بھی آ رہے ہیں اور کرکٹ ٹیم اپنے جوہر دکھا کر واپس جا چکی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہو رہا ہے کہ بھارت سے تحفتاً آنے والی کتابوں اور رسالوں کو کسٹم والے روک رہے ہیں۔ شہر کے کئی ادیبوں کو محکمۂ کسٹم کی طرف سے اس مضمون کے نوٹس موصول ہوئے ہیں کہ آپ کے نام بھارت سے کتابوں کا ایک پیکٹ آیا ہے، امپورٹ لائسنس پیش کیجیے ورنہ ان کتابوں پر ڈیوٹی لگا دی جائے گی۔ نوٹس موصول کرنے والے پریشان ہیں کہ اس سکھا شاہی کا جواز کیا ہے۔ ہمارے ایک دوست کے نام اس قسم کا ایک نوٹس گزشتہ سال اکتوبر میں آیا تھا۔ انہوں نے جواب میں لکھا۔ "میں ایک ادیب ہوں۔ کئی کتابوں کا مصنف ہوں۔ مجھے اکثر پاکستانی اور بھارتی ادیب اپنی کتابیں تحفتاً یا اظہارِ رائے کے لئے بھیجتے ہیں۔ آپ نے کتابوں کے جس پیکٹ کے حوالے سے نوٹس بھیجا ہے، مجھے معلوم نہیں کہ وہ پیکٹ ہندوستان کے کس ادیب کی طرف سے آیا ہے۔ امپورٹ لائسنس پیش کرنے کا مطالبہ تو اس وقت کیا جاتا جب یہ کتابیں میں نے خود منگوائی ہوتیں جہاں تک ڈیوٹی لگانے کا تعلق ہے، آپ قانون کے مطابق عمل کیجیے، لیکن یہ تو بتا دیجیے کہ اس پیکٹ میں جو کتابیں ہیں ان کے نام کیا ہیں۔ اگر یہ کتابیں ڈیوٹی ادا کر کے حاصل کرنے کے لائق ہوں گی تو میں ڈیوٹی ادا کر دوں گا، ورنہ آپ یہ کتابیں اس شخص کو واپس بھیج دیجیے گا، جس نے میرے نام ارسال کی ہیں!"

محکمۂ کسٹم نے گزشتہ اکتوبر میں بھیجے جانے والے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس دوران میں ہمارے دوست کو انجمن ترقی اردو ہند کے سیکرٹری ڈاکٹر خلیق انجم کا خط موصول ہوا کہ دیوانِ غالب مرتبہ امتیاز علی عرشی کے نئے ایڈیشن کا ایک نسخہ تبصرے کے لئے بھیجا گیا تھا، اس پر آپ نے اب تک تبصرہ نہیں کیا۔ ہمارے دوست نے ڈاکٹر خلیق انجم کے خط کی نقل بھی محکمۂ کسٹم کو بھیج دی اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ دیوانِ غالب کی قیمت چالیس پچاس روپے سے زیادہ کیا ہوگی، اتنی مالیت کی کوئی بھی چیز کسی بھی غیر ملک سے تحفتاً آ سکتی ہے، اس لئے اگر اعتراض نہ ہو تو دیوانِ غالب کا یہ نسخہ مجھے بھیج دیجیے۔ لیکن محکمۂ مذکور نے اس خط کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ ممکن ہے کہ جس طرح کروڑوں روپے کی چرس پکڑنے کی خبریں اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں، اسی طرح ایک دن یہ خبر بھی دیکھنے میں آئے کہ محکمے کے مستعد کارکنوں نے دیوانِ غالب کے ایک ایسے نسخے پر قبضہ کر لیا جس میں بیشمار شعر ناجائز طور پر کشید کی ہوئی شراب کی تعریف میں تھے۔

معلوم ہوا ہے کہ گزشتہ چھ سات ماہ سے محکمۂ کسٹم میں ہندوستان سے آنے والی کتابوں کے پیکٹوں کا انبار لگا ہے۔ یہ پیکٹ تعداد میں کئی ہزار ہیں اور ان کو رکھنے کے لئے جگہ بھی نہیں مل رہی۔ معلوم نہیں ان پیکٹوں کا حشر کیا ہوگا۔

یہ تو جائز طریقے سے آنے والی کتابوں کا حال ہے، اور جو بھارتی کتابیں اور رسالے ناجائز طریقے سے پاکستان آتے ہیں، وہ کھلے بندوں فروخت ہوتے ہیں۔ شمع، روبی، بیسویں صدی اور اسٹار ڈسٹ جیسے رسالے آپ کو ہر بکسٹال پر مل جائیں گے۔ لیکن ایک روپے کا رسالہ دس روپے میں ملے گا۔ کیا محکمۂ کسٹم والے یہ بتانا پسند کریں گے کہ یہ رسالے کس طرح پاکستان آتے ہیں؟ بھیجنے والوں نے امپورٹ لائسنس پیش کئے تھے یا نہیں؟ آپ نے ڈیوٹی وصول کی تھی یا نہیں؟ شہر کی دکانیں اسمگلنگ کے مال سے بھری ہوئی ہیں لیکن کسٹم والوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اس کے برعکس اہلِ قلم کے لئے کوئی کتاب کہیں سے آ جائے تو اسے روک لیا جاتا ہے۔ ان حالات میں ہم یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ بھارت میں کیا کیا ادبی کام ہو رہے ہیں۔

بھارت والوں کا یہ حال ہے کہ وہ پاکستانی ادب اور ادیبوں کے تازہ ترین کوائف سے باخبر رہتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے پاکستانی مطبوعات پر تبصرے نشر ہوتے ہیں، ہمارے ادیب ہندوستان جاتے ہیں تو انہیں ریڈیو اور ٹی وی پر اظہارِ خیال کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ وہاں کے رسالوں میں ہمارے ادیبوں کی تحریریں کثرت سے نقل کی جاتی ہیں۔ یہی نہیں کئی رسالے سال میں ایک یا دو مرتبہ پاکستانی ادب نمبر بھی شائع کرتے ہیں حال ہی میں بمبئی کے رسالے "شاعر" نے ضخیم پاکستانی ادب نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ بھارت کی کئی یونیورسٹیوں میں "مطالعۂ پاکستان" کے شعبے قائم ہیں جس میں بطورِ خاص پاکستانی ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں ہے کہ علامہ اقبال پر ہندوستان میں جو تحقیقی کام ہوا ہے، اس سے بھی استفادہ کر سکیں!

کبھی کبھار کوئی صاحبِ ذوق ہندوستان سے دو چار کتابیں یا رسالے لے آتا ہے تو ان سے وہاں کی ادبی صورتِ حال کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے ہی صاحبِ ذوق دوست کی عنایت سے ہمیں ڈاکٹر قمر رئیس کے رسالے "عصری آگہی" کا راجندر سنگھ بیدی نمبر دیکھنے کو ملا۔ یہ ایک اہم ادبی دستاویز ہے جس سے اردو کے ایک بڑے افسانہ نگار کے فن اور شخصیت کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس میں ہندوستان کے تقریباً سبھی اہم نقادوں کے مضامین ہیں۔ پاکستانی نقاد صرف ایک ہے۔ مظفر علی سید جنہوں نے بیدی کے افسانے "گرہن" کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ ان کا یہ مقالہ ایک پاکستانی رسالے سے نقل کیا گیا ہے۔

اس نمبر کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں بیدی کے خطوط شائع کئے گئے ہیں۔ بیدی ایک بڑے افسانہ نگار تو تھے ہی، اب وہ ایک بڑے مکتوب نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ یہ سارے خط جو اوپیندر ناتھ اشک کے نام ہیں اور اشاعت کے خیال سے نہیں لکھے گئے تھے، بڑی خوبصورتی سے بیدی کی پہلودار شخصیت کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان خطوں میں ایک معصوم لیکن شوخ طبع ہمارے سامنے آتا ہے۔ بیدی کی معصومیت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ دوسروں کا ذکر کرتے ہیں، اور شوخ طبعی کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنا، اپنی بیوی کا یا مکتوب الیہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ان خطوں سے بیدی کے بعض دوستوں کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"تم جانتے ہو ادیبوں میں کس قدر گروہ بندی ہے۔ سردار جعفری اور کرشن ہی تو ان کے سربراہ ہیں... اگر یہاں پہنچ کر کسی نے کرشن کا پتہ بھی پوچھا ہے تو میں گاڑی میں بٹھا کر اسے کرشن کے یہاں لے گیا ہوں..." احساسِ کمتری" کے ان چند لمحوں میں مجھے یہ خیال آیا کہ میں بیسیوں بار اس شخص کے یہاں گیا ہوں، اسے کیوں خیال نہیں آیا کہ میں دادر سے گزر رہا ہوں، بیدی قریب رہتا ہے، چلو اس کے یہاں سے ہوتے جاؤ۔ اور جب میں نے اس سے اس امر کی شکایت کی تو اس نے مجھ سے باہر بھی ملنا جلنا ترک کر دیا۔ میں...... سیکڑوں بار کسی میٹنگ کے بہانے یا ایسے ہی عباس صاحب کے یہاں گیا ہوں۔ پچھلے دنوں انہیں اپنی فلم کے سلسلے میں مالی اعانت کی ضرورت پڑی۔ وعدے کے باوجود، اپنے حالات کے پیشِ نظر میں تو انہیں کچھ نہ دے سکا، البتہ اپنے دوست سہگل سے ہزار روپے دلوا دیئے (ادھار نہیں) اور جب میں نے سہگل سے ملوانے کے لئے عباس صاحب کو اپنے یہاں دعوت دی تو انہوں نے پوچھا: جانتے ہو تم کہاں رہتے ہو؟ تو یہ ہیں ہماری دوستیاں!"

کرشن چندر سے انہوں نے اپنے خطوں میں خاصی "بے تکلفی" کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھا ہے۔ "میراجی چاہتا تو میں بھی گھٹیا لکھ سکتا تھا کرشن چندر کی طرح سے۔" پرکاش پنڈت نے بھی ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے کرشن کے بارے میں بیدی کی رائے معلوم ہوتی ہے۔ جب بیدی کا ناولٹ "ایک چادر میلی سی" شائع ہوا تو کرشن چندر نے بیدی سے کہا۔ "ظالم! تمہیں معلوم نہیں تم نے کیا چیز لکھ ڈالی ہے!" بیدی نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے کیونکہ میں ہمیشہ سوچ سمجھ کر لکھتا ہوں!" ہم پیٹ لوگوں کی کمینگیوں کے بارے میں بیدی ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "یار لوگوں نے تو میرے...... (چند افسانوں) کے متعلق یہی کہنا شروع کر دیا ہے کہ وہ چرائے ہوئے ہیں۔ یا یہ فلاں نے فلاں ہی فلاں سے متاثر ہو کر لکھے ہیں۔ ان ہم پیشہ

لوگوں کی جب یہ کمینگیاں دیکھتا ہوں تو مجھے چیخوف کا ماسکو ہیملٹ یاد آتا ہے جس میں اُس نے اس طبقے کے سفلہ پن کو بے نقاب کیا ہے۔ اسے پڑھ کر یہی خیال آتا ہے کہ مصنف اور اس کی زندگی پر تین حرف۔ اُن مضمون پر تین حرف جن میں تم بھی شامل ہو۔"

ایک مثال بیدی کی سادگی اور معصومیت کی بھی دیکھئے۔

"آج بہت اُداس خاطر ہوں۔ آج ایک عجیب واقعے نے مجھے اور بھی پریشان کر دیا ہے۔ میں ادارہ "ادب لطیف" میں بیٹھا تھا کہ کہیں سے گوپال متل آ نکلے۔ میں کسی مضمون "ادب العالیہ اور ترقی پسندی" پر گفتگو کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں گوپال متل جو کہ ترقی پسندوں کے مروجہ عقیدے کے قائل ہیں، اُن سے بحث ہو پڑی۔ اور بحث میں، میں انتہائی کمزور واقع ہوا ہوں۔ اُس نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ موقع ایسا تھا کہ مجھے کوئی دلیل ہی نہ سوجھتی تھی اور سوجھی بھی تو بے معنی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ مجھے خفت اُٹھانا پڑی۔ اب ہنسنے کی بات یہ ہے کہ شکست خوردہ گھر آیا ہوں تو بہت دلیلیں سوجھ رہی ہیں ...... کبھی یہ خیال آتا ہے کہ میں محض ایک افسانہ نگار ہوں، میں نے بحث کیوں کی۔ اور پھر بحث میں بعض بہت بری باتیں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً گوپال اس بات پر مصر تھا کہ کرشن چندر نے "نظارے" میں ترقی کی ہے اور میں کہہ رہا تھا کہ تنزل کیونکہ وہ ترقی پسندی کا ایک معین مطلب لے رہا ہے۔"

اب بیدی کی شوخ طبعی کے کچھ نمونے بھی دیکھئے۔

"دانہ و دام میں پنسل اسکیچ جو ہے، اس میں میں کیا کچھ معمر دکھائی دیتا ہوں؟ چہرے پر لکیریں ہیں، لیکن مجھے پسند ہے کیونکہ اس سے فراڈ میں جامعیت پیدا ہوتی ہے۔"

"مسز سرن نے مجھ سے کہا، آپ بہت معروف آدمی ہیں۔ میں نے کہا، صرف معروف ہوں، آدمی کہاں؟ وہ بہت خوش ہوئیں۔ میں اب اُس منزل پر پہنچ گیا ہوں جہاں اپنے سکھ چولے کی نہیں، صرف ہونے کی عذر داری کرنی پڑتی ہے۔"

"اس وقت صبح کے تین بجے ہیں۔ گھر میں ککّو کے سوا کوئی نہیں۔ آہستہ آہستہ سب مجھے چھوڑ گئے ہیں۔ بہو اور نریندر اپنے فلیٹ ...... میں ہیں۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھر اور بیوی جینے بھرے اُدھر پنجاب کے چکر کاٹ رہی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ کہیں کوئی کنوارہ لڑکا ہو .... تو کسی بھی کنواری لڑکی سے اس کی شادی کر دے یا کرا دے جتنی دیر میں وہ لوٹے گی کچھ اور لڑکیاں جوان ہو چکی ہوں گی۔ اس کام میں وہ بھول جاتی ہے کہ اس کے اپنے گھر میں ایک ازلی کنوارا بیٹھا ہے۔ میں!"

"مالی حالت اس قدر خراب ہو گئی ہے کہ کیا بتاؤں۔ ڈر کے مارے تمہیں زیادہ لکھ بھی نہیں کہ بیوقوف کہو گے۔ اگر میں واقعی بے وقوف نہ ہوتا تو کسی کے بیوقوف کہنے کا برا نہ مانتا۔"

"بنارسی داس چترویدی مجھ سے بھی زیادہ بے وقوف معلوم ہوتے تھے۔ سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہنستے تھے تو معلوم ہوتا تھا جیسے ہنسی کہیں زمین پر گر گئی۔"

"کوشلیا (اشک) کی طبیعت اب کیسی ہے۔ وہ بیمار ہو کر اب کیا رہ گئی ہوگی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی نے کنہیا لال کپور کے بارے میں لکھا تھا ...... "وہ دُبلا ہو گیا ہے۔"

بیدی کی شخصیت پر یوسف ناظم، پرکاش پنڈت اور دیویندر ستیارتھی کے مضامین بہت دلچسپ ہیں۔ ان مضامین میں بہت سے دلچسپ واقعات بیان کئے گئے۔ کچھ آپ بھی سنئے۔

ایک بار بیدی صاحب کے ایک عیسائی دوست نے ان کے سکھ ہونے کا مذاق اڑانے کے لئے پوچھا۔ "بیدی صاحب آپ سکھوں کے جو بارہ بجتے ہیں، اس میں کہاں تک صداقت ہے؟"

"کافی صداقت ہے"۔ بیدی صاحب نے اقرار کیا۔

"پھر تو آپ کے بھی بارہ بجتے ہوں گے۔"

"ضرور بجتے ہیں۔"

"اس وقت کیا ہوتا ہے۔"

"یہی کہ کوئی غلط حرکت کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"اچھا اب یہ بتائیے کہ یہ بارہ کس وقت بجتے ہیں۔ دوپہر کو یا رات کو؟"

"دوپہر کو"۔ بیدی صاحب نے کہا۔ "کیونکہ اس وقت گرمی بہت ہوتی ہے اور گرمی میں سر کے لمبے لمبے بالوں اور پگڑی کی وجہ سے ہر سکھ بوکھلا جاتا ہے۔"

"لیکن بیدی صاحب" عیسائی دوست نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "ہمارے محلے میں ایک ایسا سکھ رہتا ہے جو رات کے بارہ بجے بوکھلاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ وہ اصلی سکھ نہیں ہوگا۔" بیدی صاحب نے جواب دیا۔ "عیسائی سے سکھ بنا ہوگا۔"

"بیدی صاحب سبک قد ہیں لیکن ان کے گرم فرما ڈاکٹر ڈی ڈی کشپ بہت دراز قد تھے۔ ایک بار دن کے وقت دونوں سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ کشپ صاحب پسینے میں شرابور تھے لیکن بیدی صاحب کو پسینہ نہیں آ رہا تھا۔ ایک جگہ کشپ صاحب رک کر بولے۔ "بیدی صاحب کیا وجہ ہے کہ مجھ کو پسینہ آ رہا ہے آپ کو نہیں۔" بیدی صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ "وجہ ظاہر ہے آپ سورج سے زیادہ قریب ہیں۔"

اس نمبر میں بیدی کے تین انٹرویو بھی ہیں۔ ان سے جہاں بیدی کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا ہے، وہیں بعض ہم عصروں کے بارے میں ان کی رائے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بیدی سے سوال کیا گیا۔ آپ کے بعد جوگندر پال، سریندر پرکاش، بلراج مین را، انور سجاد، انتظار حسین، رام لعل وغیرہ منظر عام پر آئے۔ یہ آپ کی نسل سے کس حد تک مختلف ہیں ان کی تخلیقات آپ کی نظر سے گزری ہوں گی۔ مطمئن ہیں آپ؟"

بیدی نے جواب دیا "ان میں سے کچھ لوگوں کا تو میں فین ہوں ...... پہلا نمبر میری نظر میں انتظار حسین کا آتا ہے، پھر انور سجاد، پھر رام لعل، جوگندر پال ...... افسانہ کہنے کا فن اسی ترتیب میں انتظار حسین، انور سجاد، رام لعل میں بہت عمدہ ہے۔ یہ لوگ افسانہ کہنے کا فن بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔"

بیدی کی انسان دوستی کا ایک واقعہ بھی سن لیجئے جو بیدی کے چھوٹے بھائی ہربنس سنگھ بیدی نے بیان کیا ہے۔ "فسادات کے دوران بیدی صاحب نے شملہ میں مقیم مسلمانوں کی جانیں بچائیں اگرچہ ہمارے گاؤں میں ہمارے تایا جی اور کئی ایک رشتہ دار قتل ہو چکے تھے وہ اور ان کے دوست ایشور سنگھ بیدی جو ایک مصور اور پنجابی کے ادیب تھے، کرپان لے کر گھومتے جو صرف حفاظت کے کام آتی۔ کئی لوگوں کو بچا بچا کر پاکستان جاتے ہوئے ٹرکوں میں پہنچایا۔ ایک واقعہ مجھے خاص طور پر یاد ہے۔ چند شخص ایک آدمی کو گھیرے ہوئے تھے جو نہایت ہراساں تھا۔ چلا رہے تھے کہ یہ مسلمان ہے ...... مار ڈالنے کی فکر میں تھے۔ بیدی صاحب اور ایشور سنگھ نے بڑھ کر کہا۔ اسے ہمارے حوالے کر دو، ہم ٹھکانے لگا دیں گے۔ ہاتھ میں لمبی کرپان دیکھ کر اسے بیدی صاحب کے سپرد کر دیا گیا۔ اسے گھر لائے، کھلایا پلایا اور حفاظت سے روانہ کیا۔"

اور آخر میں ایک دلچسپ بات یہ کہ بیدی ایک زمانے میں شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کا کلام ۱۹۳۱-۳۲ء میں لاہور کے اخبارات میں، محسن لاہوری کے نام سے چھپتا تھا۔

انتظار حسین سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے کا نام "علامتوں کا زوال" کیوں رکھا ہے، "تنقید کا زوال" کیوں نہیں رکھا"؟ انہوں نے جواب دیا "یہ نام میں نے قمر جمیل کے تنقیدی مجموعے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔"

ہماری رائے میں سوال بھی غلط ہے اور جواب بھی غلط!

سوال اس لئے غلط ہے کہ انتظار حسین کے مجموعے کا تنقید کے زوال سے کوئی تعلق نہیں۔ جواب اس لئے غلط ہے کہ قمر جمیل کے زوال کا تنقید سے کوئی تعلق نہیں۔

ممکن ہے بعض لوگ اس وضاحت کو ناکافی تصور فرمائیں اس لئے ضروری ہے کہ انتظار حسین اور قمر جمیل پر الگ الگ گفتگو کی جائے کہ ان دونوں میں ایک تخلیقی فنکار ہے اور دوسرا صرف فن کار۔ ایک ساتھ گفتگو کرنے سے صورتِ حال خراب تر ہو سکتی ہے کہ خراب پہلے ہی ہے۔

پہلے انتظار حسین ......

محمد حسن عسکری کی زبان میں انتظار حسین ہمارے اُن ڈیڑھ دو ادیبوں میں سے ہیں جو تخلیقی سطح پر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت مسلسل فراہم کرتے رہتے ہیں۔ "علامتوں کا زوال" بھی ان کے تخلیقی سفر ہی کا حصہ ہے جسے ہم مروجہ تنقید سے الگ کرنے کے لئے تخلیقی تنقید کہہ سکتے ہیں۔ تخلیقی تنقید اور غیر تخلیقی تنقید میں کیا فرق ہے، اسے آپ یوں سمجھئے کہ "علامتوں کا زوال" میں جن موضوعات پر مضامین شامل ہیں، ان موضوعات پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور اسی قسم کے دوسرے ڈاکٹروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ڈاکٹروں کے مضامین پڑھئے تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے بی اے اور ایم اے کا نصاب مرتب کیا جا رہا ہے۔ انتظار حسین کے مضامین پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے اس شخص کو درس و تدریس سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ لکھنے والے کے پاس کچھ باتیں ہیں جنہیں وہ پڑھنے والے تک اس لئے پہنچانا چاہتا ہے کہ پڑھنے والا خود بھی ان باتوں پر غور کرے گویا انتظار حسین کا مسئلہ صرف اظہارِ خیال نہیں، خیال انگیزی بھی ہے۔ غیر تخلیقی تنقید سوچنے کا موقع فراہم نہیں کرتی، بلکہ وہ فیصلوں کے ذریعے سوچنے کی قوت ہی سلب کر لیتی ہے۔ تخلیقی تنقید

سوچنے کے سلسلے کو آگے بڑھاتی ہے، پہلے نقاد سوچتا ہے اور پھر قاری۔

جو لوگ ادب کے بعض مسائل پر کچھ سوچنا چاہتے ہیں، انھیں انتظار حسین کا تنقیدی مجموعہ ضرور پڑھنا چاہیئے۔ ان میں خوبصورت باتیں بھی ہیں اور خوبصورت نثر بھی۔ انتظار حسین نے تنقید کی۔ مدرسانہ اصطلاحوں اور عامیانہ فارمولوں سے گریز کیا ہے اور کہیں ایسا پیرایہ اختیار نہیں کیا جس سے یہ تاثر ملتا ہو کہ لکھنے والا محض اس لئے لکھ رہا ہے کہ اس کے ہاتھ میں قلم ہے اور سامنے سادہ کاغذوں کا ڈھیر رکھا ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"تنقید کا ایک پامال موضوع ہے "ادب اور تصوف"۔ اس موضوع پر تقریباً ہر پیشہ ور نقاد نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے کیونکہ ایم اے کے امتحان میں ایک سوال اس موضوع پر ضرور ہوتا ہے۔ پیشہ ور نقاد پہلے یہ بتاتے ہیں کہ تصوف کیا ہے اس لفظ کی اصل کیا ہے؟ صوفی کسے کہتے ہیں؟ تصوف کا آغاز کہاں سے ہوا؟ تصوف کے کتنے سلسلے ہیں اور ہر سلسلے کی کیا خصوصیات ہیں؟ پھر بہت سی اصطلاحیں بھی زیر بحث آتی ہیں۔ وحدت وجود وحدت شہود، وحدت مجازی، وحدت مطلق، ولایت کبریٰ، مشاہدہ مراقبہ اور اسی قسم کی بیسیوں اصطلاحات کی تشریح کی جاتی ہے پھر ادب سے تصوف کی پیوند کاری کر کے بتایا جاتا ہے کہ کتنے صوفی ایسے تھے جو شعر کہتے تھے، اور کتنے شاعر ایسے تھے جن کا رجحان تصوف کی طرف تھا۔ آخر میں میر درد کا ذکر کرتے ہوئے

کبوتر بیٹھے ہیں اور اندر موم بتیوں کے دھندلکے میں کوئی عورت اپنی مراد مانگ رہی ہے اور باہر ایک سائیں دوتارہ بجا رہا ہے اور کافیاں پڑھ رہا ہے۔ یہ سلسلہ ختم ہو جائے تو شعر اور افسانہ ختم ہو جائیں گے۔ بس فاضل پروفیسروں کی تنقید رہ جائے گی۔

انتظار حسین کے مجموعے میں سارے مضامین مزید ہیں، یہاں تک کہ وہ مضامین بھی جو انہوں نے پاک ٹی ہاؤس کے اپنے دوستوں کو "قدآور" بنانے کے لئے لکھے ہیں۔ دوستی کے معاملے میں انتظار حسین کا نقطۂ نظر واضح ہے۔ انہیں زاہد ڈار پسند ہے، اس لئے اُس کی شاعری بھی پسند ہے۔ احمد مشتاق اچھا لگتا ہے اس لئے اُس کی شاعری بھی اچھی لگتی ہے۔ غالب احمد شریف آدمی ہے، اس لئے اُس کی شاعری بھی شریفانہ ہے۔ لہٰذا ان مضامین کو تنقید کے کھاتے میں نہیں، دوستی کے کھاتے میں ڈالنا چاہیئے۔ انتظار حسین تنقید کے کھاتے میں حساب کتاب درست رکھتے ہیں، دوستی کے کھاتے میں البتہ گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں کہ آخر انھیں رہنا تو لاہور ہی میں ہے اور لاہور والوں کو کیسے ناراض کر سکتے ہیں۔

احمد مشتاق پر یاد آیا کہ اُن کے ایک مداح شمس الرحمٰن فاروقی بھی ہیں جن کی مداحی بھی مدلل ہوتی ہے اور تنقیدی دشنام طرازی بھی۔ وہ ماننے پر آتے ہیں تو احمد مشتاق کو شاعر مان لیتے ہیں، انکار پر اترتے ہیں تو فراق گورکھپوری کو شاعر ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ انھیں فراق کے ہاں قدر اوّل کے دس بیس شعر بھی نہیں ملتے۔ "نیا دور" کے تازہ شمارے

کہ وہ شاعری بھی علم ہی کے زور پر کرتے ہیں۔ حالانکہ شاعری کے لئے صرف علم کا ہونا کوئی معقول جواز نہیں ہے۔

ایک واقعہ یاد آگیا۔ آپ بھی سن لیجئے۔ تین برس پہلے جب فاروقی صاحب کراچی آئے تھے تو ایک ادبی محفل میں اُن سے سوال کیا گیا۔ "آپ نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی۔ آپ ان دونوں میں سے اپنی کس حیثیت کو اہم سمجھتے ہیں؟"

فاروقی صاحب نے جواب دیا۔ "مجھے جب کچھ کہنا ہوتا ہے تو تنقید لکھتا ہوں ......"

ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک صاحب نے جملہ یوں مکمل کیا۔ "اور جب کچھ نہیں کہنا ہوتا تو شاعری کرتا ہوں"۔

خیر فاروقی صاحب خود جیسی شاعری چاہیں کریں، لیکن بیچارے احمد مشتاق کو تو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ کریں کہ وہ فراق سے بہتر شاعر ہیں۔ آج احمد مشتاق کو فراق سے بہتر کہا گیا ہے کل انہیں میر و غالب سے بھی بڑا شاعر قرار دیدیا جائے گا اور پھر ایک دن دلی میں میر سیمینار کی طرح احمد مشتاق سیمینار ہوگا جس کی صدارت شمس الرحمٰن فاروقی کریں گے اور مقالے پڑھنے کے لئے پاکستان سے بھی کچھ لوگوں کو بلایا جائے گا۔ ان میں انتظار حسین ضرور ہوں گے کہ وہ سیمینار کے بہانے ڈبائی کی سیر کر آئیں گے۔ اس سیمینار میں شمس الرحمٰن فاروقی کا خطبۂ صدارت سننے کے قابل ہوگا۔ اس میں وہ اس قسم کی بات ضرور کہیں گے کہ ـــــ "حضرات! فراق کی طرح میر و غالب کے ہاں بھی زبان کی غلطیاں اتنی زیادہ ہیں کہ انہیں شاعر ماننے کو جی نہیں چاہتا۔ اُردو زبان میں تو بس ایک ہی شاعر ہے اور وہ

وعلامتوں کا زوال یا تنقید کا زوال۔ و قمر جمیل کبھی اچھے شعر بھی کہا کرتے تھے)

و آجکل کئی طوطے نثری نظم کی توپ چلا رہے ہیں۔

و ان کا شمار پس ماندگان سخن میں ہوتا ہے۔

اقبال کے ہاں تصوف کا سراغ لگایا جاتا ہے اور اس طرح ادب اور تصوف کے باہمی تعلق کا حق ادا کر دیا جاتا ہے۔

لیکن انتظار حسین ادب اور تصوف کے تعلق کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ تصوف کی تاریخ زیر بحث آتی ہے نہ کوئی اصطلاح۔ کسی صوفی شاعر کا حوالہ آتا ہے، نہ کسی شاعر صوفی کا۔ اس کے باوجود پڑھنے والے کو ایک نیا جہان معنی نظر آتا ہے۔ یہ مضمون اتنا مربوط ہے کہ اس کا کوئی حصہ بطور اقتباس پیش کر کے پورے مضمون کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس کا آخر پیراگراف ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس سے کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ انتظار حسین نے اپنی بات ختم کس طرح کی ہے۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں تصوف کی روایت زندہ تہذیبی اداروں کی صورت میں کارفرما ہو، ادب کو بار بار اس روایت سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سے استفادہ سے وہ اپنے آپ کو زیادہ قابل قبول بناتا ہے۔ یہ روایت موجود ہو اور پھر ادب اس سے استفادہ نہ کرے تو وہ اردو کی نئی شاعری بن کر رہ جاتی ہے کہ وہ رسالوں میں تو چھپتی ہے مگر دل و دماغ پر نقش نہیں چھوڑتی۔ اصل میں ہمارے ہاں شعر اور افسانہ زندہ ہی اس وجہ سے ہیں کہ شاہ رکن الدین عالم کے مزار کے گنبد پر

میں فاروقی صاحب نے فراق پر ایک مقالہ لکھا ہے جس میں انہوں نے احمد مشتاق کو فراق سے بہتر شاعر قرار دیا ہے۔ انہوں نے فراق گورکھپوری کی شاعری میں وہ تمام معائب دیکھے ہیں جو حسرت موہانی نے اپنی محاسن و معائب سخن والی کتاب میں گنوائے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے حسرت موہانی کی کتاب کے مطالعے کے فوراً بعد فراق کی شاعری کا مطالعہ کیا۔ افسوس کہ انہوں نے معانی و بیان کی اصطلاحوں کی سیڑھی لگا کر فراق کی بلندی تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اگر وہ اپنی سطح پر ہی رہ کر فراق کا مطالعہ کرتے تو وہ یقیناً کسی معقول نتیجے تک پہنچتے۔

فاروقی نے احمد مشتاق کو اتنے بڑے منصب پر فائز کر دیا حالانکہ خود فاروقی اس منصب پر فائز ہونے کے لائق تھے۔ وہ احمد مشتاق سے زیادہ مشہور شاعر ہیں، اور شعر بھی ایسے کہتے ہیں جیسے کوئی شاعری پر شب خون مار رہا ہے۔

ہمارے وہ نقاد جو ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں، جب خود شاعری کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ خوب سے خوب تر کی تلاش کرتے کرتے تھک گئے ہوں۔ فاروقی بھی ایسے ہی پسماندگان سخن میں سے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں، اور وہ جتنی تنقیدی غلطیاں کرتے ہیں، اپنے علم ہی کے زور پر کرتے ہیں، لیکن افسوس

احمد مشتاق ہے۔ ایک ہی نقاد ہے۔ اُس کا نام بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ آپ کے سامنے ہے"۔

اس کالم کا پہلا پیراگراف دوبارہ پڑھ لیجئے کہ اب ہم اس پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ قمر جمیل کے زوال کا تنقید سے تعلق کیوں نہیں ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی طرح قمر جمیل بھی صاحب علم ہیں، اس کے باوجود وہ ایک زمانے میں بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ اُس زمانے کے بےشمار شعر ہمیں یاد ہیں۔ کچھ آپ بھی سنیئے:

ہمیں ہی نہیں اپنی نقصان کا سبب
تو بھی مرے سینۂ سوزاں میں ہے
ایک پتھر کہ دستِ یار میں ہے!
پھول بننے کے انتظار میں ہے
آپ زنجیر ہو گیا ہوں کہ پھر
مجھ کو فرصت بھری بہار میں ہے
اپنی ناکامیوں پہ آخر کار!
مسکرانا تو اختیار میں ہے

میرے خدا نے بہت صبر کیا میرے ساتھ
ورنہ کیا سانحہ کیا نہ ہوا میرے ساتھ
عمر رفتہ لے گئی میرا سکوں چھین کر
اور مرے صبر کو چھوڑ دیا میرے ساتھ

ہاں دل کے قریب آ کے دیکھو
شعلہ نہ سہی دھواں بہت ہے

اے دامنِ گُل گواہ رہنا
کچھ داغ بھی ہیں گلاب جیسے
یوں دل میں ترا خیال آیا
صحرا میں کھلے گلاب جیسے

کیسا عالم ہے کہ تنہائی بھی
در و دیوار سے ٹکراتی ہے

اتنے اچھے شعر کہنے والا جب نثری نظم کے نقار خانے میں داخل ہوا تو اس کے اچھے شعر طوطی کی صدا بن گئے۔ قمر جمیل اگر نثری نظم کے نفسِ ناطقہ بننے پر قناعت کرتے تو غنیمت تھی لیکن غضب یہ ہوا کہ وہ نثری نظم کے نفسِ امارہ بھی بن گئے اور یوں ایک اچھا شاعر ادبی دنیا سے طویل رخصت پر چلا گیا۔ یہی رخصت جو ریٹائرمنٹ سے پہلے لی جاتی ہے۔

نثری نظم کے ساتھ ساتھ انہوں نے کالم نگاری بھی شروع کر دی ان کی نثری نظموں میں کالموں کا اور کالموں میں نثری نظم کا رنگ اس طرح جھلکنے لگا کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نثری نظم کہاں ختم ہوئی اور کالم کہاں سے شروع ہوا۔ کاش وہ کالم لکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی شرح بھی لکھ دیا کریں تاکہ ہم جیسے کم علموں کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔

گزشتہ ہفتے انھوں نے ہم پر بھی کرم فرمایا ہے اور وہ بھی ایک اطالوی ناول کے حوالے سے اس ناول میں ترکوں کی توپ کی زد میں اگر ایک شخص کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ قمر جمیل صاحب نے مشورہ دیا ہے کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر قمر جمیل صاحب ان توپوں کے سلسلے میں بھی ہماری رہنمائی کر دیتے تو ہمارے ملک میں موجود ہیں مثلاً لاہور میں بھنگیوں کی توپ ہے جو ہارڈ کیکنگ کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ کراچی میں نثری نظم کی توپ ہے۔ کیا ان خاموش توپوں کے سامنے چلنے میں بھی نقصان کا اندیشہ ہے؟ ویسے ہمارا خیال ہے کہ محتاط لوگوں کو ہر قسم کی توپ کے سامنے چلنے سے گریز کرنا چاہیے۔ خواہ وہ توپ کیوں نہ ہو جسے بازی گر کا طوطا چلاتا ہے۔

شاعری اور اداکاری

ہمارے ایک غائبانہ کرم فرما جناب ابو سیم صاحب نے کراچی سے ایک دلچسپ خط لکھا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں.... "میں ایک عرصے سے آپ کا کالم پڑھ رہا ہوں۔ یہ کالم مجھے اس وجہ سے پسند ہے کہ آپ کی تنقید تعمیری ہوتی ہے، تخریبی نہیں۔ آپ کسی فرد یا ادارے کو تنقید سے بالا نہیں سمجھتے اور ہر طرح کی مصلحتوں سے بے نیاز ہو کر اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں لیکن مجھے آپ سے ایک شکایت بھی ہے کہ آپ بعض غیر اہم لوگوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور بعض اہم لوگوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ آپ کے کالموں میں ایسے لوگوں کا ذکر پڑھا ہے جن کی کوئی ادبی اہمیت نہیں۔ اس کے برعکس آپ نے بعض اہم ادیبوں کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔ تازہ ترین مثال ساقی فاروقی کی ہے۔ ساقی صاحب پچھلے دنوں پاکستان تشریف لائے تھے۔ ہر شہر میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اخباروں میں ان کے انٹرویو شائع ہوئے۔ ریڈیو اور ٹی وی سے خاص پروگرام نشر ہوئے۔ کالم نگاروں نے ان کے بارے میں بے شمار کالم لکھے لیکن آپ نے چپ سادھ لی، ایک لفظ نہیں لکھا۔ آخر کیوں؟"

ابو سیم صاحب! آپ کی توجہ کا شکریہ کہ آپ باقاعدگی سے ہمارا کالم پڑھتے ہیں۔ آپ نے ہماری جو تعریف کی ہے اس سے بے حد خوشی ہوئی۔ ہم اپنے کالموں کا مجموعہ شائع کر رہے ہیں، اس کی تقریبِ رونمائی کا بھی ارادہ ہے۔ آپ کا خط پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ آپ اس تقریب میں تشریف لائیں اور ایک عدد مقالہ پڑھیں۔ امید ہے آپ اس سلسلے میں حوصلہ افزا جواب سے نوازیں گے۔

آپ نے جو شکایت کی ہے، وہ کسی حد تک درست ہے۔ ہمیں خود اس کا احساس ہے کہ بعض دفعہ ہم نے اپنے کالموں میں ایسے لوگوں کا ذکر بھی کیا جن کے بارے میں معلومات کا واحد ذریعہ ہمارے کالم ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے کہ ہم بعض اہم لوگوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔ ساقی فاروقی کے بارے میں ہم نے گزشتہ سال ایک کالم لکھا تھا۔ جب ان کا مجموعۂ کلام "رازوں سے بھرا بستہ" شائع ہوا تھا اس مرتبہ ہم نے اس لئے کچھ نہیں لکھا کہ ہمارے پاس لکھنے کے لئے کوئی بات نہیں تھی جو ایک آدھ بات ذہن میں آئی بھی تھی اسے برادرم راغب شکیب لے اُڑے، یعنی وہی احمد فراز اور ساقی فاروقی کی معاصرانہ چشمک۔ ہاں ٹی وی پر ہم نے ان کی نظم "بورے میں بند بلا" سنی تھی، اس پر اس لئے کچھ نہ لکھا کہ بلا بورے سے باہر آ جاتا۔

بہرحال ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ساقی فاروقی کو نظر انداز کرنے کا کوئی ذاتی سبب نہیں بلکہ ذاتی طور پر تو وہ ہمیں شاعر ہی نہیں اداکار بھی اچھے لگتے ہیں، ان کی شاعری تو خیر ویسی ہی ہے جیسی ہونی چاہیے لیکن اداکاری بے مثال ہے۔ یہ اسی اداکاری کا نتیجہ ہے کہ دلی، لاہور، کراچی اور سرگودھا میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ دلی میں گوپی چند نارنگ نے ان کے کلام میں ویسے ہی محاسن تلاش کر لئے ہیں۔ جیسے کسی زمانے میں عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کے کلام میں تلاش کئے تھے۔ لاہور اور سرگودھا میں احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا انھیں اپنا محبوب نظر سمجھتے ہیں (ان دونوں میں بس یہی ایک قدر مشترک ہے) کراچی میں سلیم احمد انھیں جاذب قریشی کے مرتبے کا شاعر سمجھتے ہیں۔ یہ باتیں ساقی کی شاعری سے زیادہ ان کی اداکاری ہی کا نتیجہ ہیں۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اداکاری کا ذکر ہم تحقیراً نہیں کر رہے۔ اگر اداکاری عیب کی بات ہوتی تو مستنصر حسین تارڑ اور ڈاکٹر انور سجاد اپنے اداکار ہونے پر فخر نہ کرتے۔ یہ دونوں جتنے اچھے ادیب ہیں۔ اُتنے ہی اچھے اداکار بھی ہیں اور اب تو جناب احمد ندیم قاسمی نے بھی انکشاف کیا ہے کہ ایک زمانے میں انھیں اداکاری سے دلچسپی رہی ہے چند روز ہوئے انھوں نے ایک مقامی اخبار میں اپنے عہدِ اداکاری کے کچھ واقعات لکھے ہیں۔ ایک واقعہ آپ بھی سنئے:

"ہمیں کو دیکھئے کہ کالج کے دنوں میں آغا حشر کاشمیری کے ایک ڈرامے "رستم و سہراب" میں سہراب کا مرکزی کردار ادا کرتے رہے تھے۔ ہم نے زرہ بکتر سے ملتا جلتا لباس پہن رکھا تھا اور سر پر سلمی ستارے کی تاج نما ٹوپی تھی اور پہلو میں خنجر لٹک رہا تھا۔ ہمارے سامنے ڈرامے کے ولین کو لایا گیا جسے دیکھتے ہی ہمیں خنجر میان سے نکال لینا تھا مگر پھر ولین کو معاف کر دینا تھا اور خنجر کو ایک شاہانہ شان کے ساتھ واپس میان میں رکھ دینا تھا۔ ہم نے یہ سب کچھ کمال ہنرمندی سے کیا مگر جب مجرم کو معاف کرنے کے بعد ہم نے خنجر کو ایک شان کے ساتھ تیزی سے میان میں داخل کیا تو میں کے خنجر نے گتے کی میان پھاڑ کر ہماری ہتھیلی پر چرکا لگا دیا۔ ہم لہو لہو ہو گئے مگر تماشائیوں نے سمجھا کہ یہ نقلی لہو ہے۔ درد اتنا شدید تھا کہ رونے کو جی چاہ رہا تھا مگر اچانک ہمیں اپنا منصب یاد آیا کہ سہراب لوگ رویا نہیں کرتے چنانچہ ہم آنسو پیتے رہے اور مکالمے بولتے رہے۔"

اگر قاسمی صاحب کے لئے اداکاری ذریعۂ عزت ہو سکتی ہے تو ساقی فاروقی کے لئے کیوں نہیں ہو سکتی، فرق یہ ہے کہ قاسمی صاحب خود ہی مکالمے بولتے تھے اور خود ہی آنسو پیتے تھے ساقی فاروقی جب مکالمے بولتے ہیں تو سننے والے آنسو پیتے ہیں۔

بشکریہ جسارت (پاکستان)

آئندہ شمارہ میں
امرتا پریتم سے ملاقات

فیض احمد فیض

خواب بسیرا

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں میں کسی حسن کی جھلکن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم تھا ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آ کے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اک بیر نہ اک مہر نہ اک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا نہ پرایا کوئی میرا

مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط ایک گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو ابھی عمر پڑی ہے

(دورانِ علالت میو اسپتال - لاہور میں لکھی گئی)

کتابوں کی باتیں

ب-١

کچھ نئی اور کچھ پرانی مطبوعات

- کتاب : چراغ دیر
- نوعیت : غالب کی فارسی مثنوی منظوم اردو ترجمے کے ساتھ
- مترجم : اختر حسن
- سنہ اشاعت : دسمبر ١٩٧٤ء قیمت : پانچ روپے پچاس پیسے
- ناشر : انڈین لینگویجس فورم ، گیان باغ گوشہ محل حیدرآباد۔

"کوئی پندرہ برس بعد "چراغ دیر" پڑھتا ہوں۔ چند اشعار کا ترجمہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور پھر دل و دماغ پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ دو تین دن کے اندر پوری مثنوی اردو کا قالب اختیار کر لیتی ہے۔" اختر حسن

چند اشعار اور اس کے منظوم ترجمے بطور نمونہ حاضر ہے۔

بنارس را کسے گفتا کہ چین است　　　ہنوز از گنگ چینش بر جبین است

بنارس کو کسی نے چین سے تشبیہہ دے دی تھی
ابھی تک اس کے ماتھے پر شکن ہے رود گنگا کی

(١) فلک را قشقہ اس گر بر جبین نیست
ایں ایں رنگینی موج شفق چیست

فلک پہ اپنی پیشانی پہ جو قشقہ لگاتا ہے
اسی کے گلشن و گلزار سے سرخی چراتا ہے

(٢) سوادش پائے تخت بت پرستاں
سراپایش زیارت گاہ مستاں

(٣) عبادت خانہ ناقوسیاں است
ہمانا کعبہ ہندوستان است

٢۔ بنارس جان جاناں پائے تخت بت پرستاں ہے
بنارس ارض خوباں ہے زیارت گاہ مستاں ہے

٣۔ بنارس کو عبادت خانہ ناقوسیاں کہیئے
بنارس کو بجا ہے کعبہ ہندوستان کہیئے

نرالا دم زن و تسلیم لا شو　　　بگو اللہ و برق سوا شو

کتاب۔ پتھر الپتھر
ناول نگار۔ اپندر ناتھ اشک
قیمت - 20 روپے (مجلد)
کاغذ - سفید ' عمدہ
ضخامت - ١٧٦ صفحات
سائز 20x30/16
ناشر- نیا ادارہ ۵ خسرو باغ روڈ الہ آباد۔

اپندر ناتھ اشک اردو- ہندی کے معروف معتبر اور محترم ادیب ہیں۔ ان کی کئی تخلیقات کا انگریزی، روسی، مراٹھی، آسامی اور دوسری علاقائی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اشک لگ بھگ ٥٥ برسوں سے لکھ رہے ہیں۔ وہ ہمارے ان ادیبوں میں سے ہیں جن کی تخلیقات دامن دل کھینچتی ہیں اور لکھنے والے لکھنا سیکھتے ہیں۔

ان کا زیر تبصرہ ناول پتھر الپتھر پہلے بھی پاکٹ بک میں برف کا در کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ میں نے اس وقت بھی پڑھا تھا اور اب تک اس کے سحر میں گرفتار رہا تھا اب پھر پتھر الپتھر کو پڑھنے لگا تو یہ بھول ہی گیا کہ مجھے اس پر تبصرہ بھی کرنا ہے۔ یہ ناول ہر اس آدمی کو پڑھنا چاہئے جو پڑھنا جانتا ہے۔

کتاب - عکس تمنا
شاعر - کمال جعفری
ضخامت - ٩٦ صفحات
کاغذ سفید
طباعت - آفسٹ
سائز ١٨ x ٢٢ / ٨
قیمت - ١٥ روپے۔ ڈی لکس ٣٠ روپے

اس مجموعہ میں ١٩ نظمیں ہیں اور ٥١ غزلیں۔ وحید اختر نے "کمال کی شاعری میری نظر میں" کے عنوان سے لکھا "کمال جعفری نے شاعری کو خبر یا سنسنی بنانے کے بجائے اپنے تجربہ وجود کا معتبر اور سچا اظہار بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ خصوصیت ان کی غزلوں میں نظموں سے زیادہ نمایاں ہے۔"

عنوان "تشنگی کہتے ہیں" انھوں نے شعری تجربوں کے اظہار کے لئے اس زبان کو وسیلہ اظہار بنایا ہے جو خالص شعری زبان ہے لیکن اپنے ذہن کے دروازے نئے

گزر کر لا سے اِلّا کا حقیقت آشنا بن جا	لگا کر نعرہ اللہ برق باسوا بن جا

- کتاب : آواز کا جسم
- نوعیت : (تیسرا مجموعۂ کلام)
- مصنف : مخمور سعیدی
- قیمت : دس روپے۔ • سنہ اشاعت ۱۹۷۲ء
- ناشر : پی۔ کے پبلیکیشنز ۳۰۷۲ پرتاپ اسٹریٹ، گولا مارکیٹ دریا گنج دہلی

۲۹ نظموں اور ۳۹ غزلوں پر مشتمل یہ مجموعہ صاحبان ذوق کی تسکین کا اچھا سامان ہے۔ مخمور کی غزلیں اور نظمیں دونوں دامن دل کھینچتی ہیں۔

چھوتی ہیں مرے پانو بکھر جاتی ہیں لہریں
میں سوچ میں ڈوبا ہوا ساحل پر کھڑا ہوں

مرا شکار سہی وہ مگر مجھی سا ہے
لگا کے زخم اسے فکر اندمال میں ہوں

آیا تھا کس طرف سے وہ انبوہ آرزو
کیوں دل کو روندتا ہوا آگے نکل گیا

مخمور سعیدی دردمند دل رکھتے ہیں۔ لفظوں کے استعمال کا انہیں سلیقہ ہے۔ وہ لفظ کو اپنے احساس کے گرم ہونٹوں سے چھو سکتے ہیں۔ ذہن کی نرم بانہوں میں بھر سکتے ہیں۔ اور اس کا لمس بھی محسوس کر سکتے ہیں اسی لیے ان کی شاعری چاہے نظم ہو چاہے غزل جمالیاتی تسکین دیتی ہے۔

• • •

- کتاب : اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ
- نوعیت : اردو ہندی کے مشترکہ لسانی خصوصیات کا مطالعہ
- مصنف : ڈاکٹر رام آسرا راز
- سنہ اشاعت : جون ۱۹۷۵ء • قیمت : ۱۴/- روپے
- پتہ : عصری بک سنٹر ۱۳۱۰/۳ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲۔

ڈاکٹر رام آسرا راز نے بڑی محنت اور کد و کاوش سے یہ طویل مقالہ لکھا ہے اور بہت سارے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو عام طور سے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی معلوم نہیں ہیں۔ اس میں نہ صرف اُردو ہندی کے لسانی اشتراک اور اختلاف کی نشاندہی کی گئی ہے بلکہ بہت سی کہاوتوں اور تلمیحوں کے پس منظر بھی دیئے گئے ہیں۔ زبان سادہ، سہل اور مدلل ہے۔ حوالوں کی غرض سے بھی یہ کتاب بڑی اہم ہے۔

تخلیقی زبان، نئی پیکریت اور نئی لفظیات کے لئے بھی کھلے رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شعری زبان میں روایت کا حسن بھی ہے اور تجربے کی تازگی بھی۔"

ڈاکٹر مظفر حنفی نے پیش لفظ میں ادھر ادھر کی باتیں زیادہ کی ہیں اور کام کی کم بہرکیف وہ لکھتے ہیں "کمال جعفری ایسے ہی فنکاروں میں سے ایک ہیں جو پاؤں رکاب میں اور ہاتھ باگ پر جاکر غزل کہتے ہیں۔" آگے چل کر فرماتے ہیں" اکا دکا تسامحات کے علاوہ یہ احساس نہیں ہونے پاتا کہ وہ ادبی مراکز سے دور بستے ہیں۔ ایک جگہ اور لکھتے ہیں " ادبی مراکز سے الگ ہٹ کر دور افتادہ مقامات سے تعلق رکھنے والے فنکار وغیرہ۔

عکس تمنا کے عنوان سے شاعر نے اپنے اور کلام کے بارے میں چند باتوں کا ذکر کیا ہے
اب چند اشعار ملاحظہ کیجئے

ہر ایک آدمی افسردہ دکھائی دیتا ہے
عجیب شہر کا منظر دکھائی دیتا ہے۔

میں ہوں کتاب زیست کا مضمون بے بہا
مجھ کو نہ پڑھ کے پھینکئے اخبار کی طرح

گفتگو عارض و گیسو کی بھی ہوگی لیکن
درد کی دھوپ تو چہرے سے اتر جانے دو

ڈالیاں سوکھ گئیں ٹوٹ رہے ہیں پتے
کتنا ویران مرے دل کا شجر لگتا ہے۔

کمال جعفری بہت پیارے آدمی ہیں اور اچھے اچھے اشعار کہتے ہیں۔ وہ معصوم بھی ہیں مگر میں مظفر حنفی سے یہ اتفاق نہیں کر سکتا کہ وہ سادہ لوح ہیں۔ اس کا اندازہ آپ کو اس "بایوڈاٹا" سے بھی ہو سکتا ہے جو انھوں نے گرد پوش پر دیا ہے اس میں اصل نام، قلمی نام، والد کا نام، تعلیم، موجودہ شغل، موجودہ پتہ اور آبائی وطن یہاں تک کہ ننہیال تک کا پتہ درج ہے۔

کتاب مکتبہ جامعہ کی تمام شاخوں کے علاوہ فلیٹ نمبر ۴۹ آل انڈیا ریڈیو ہوسٹل کرزن روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ اور عصری آگہی پبلی کیشن 3/1610 رام نگر شاہدرہ دہلی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

تبصرے کے لئے کتاب کی دو کاپیاں بھیجئے

غزلیں

ڈبو نہ دے تجھے، خود ساختہ بھنور سے نکل
تو اپنے دائرۂ شہرتِ ہنر سے نکل

ہزار رستے یہاں، صد ہزار سمت و جہت
قدم نہ روک، کسی اور رہ گزر سے نکل

ترا مقام تو ہے تشنگی و لاعلمی
یقین و علم کے آشوبِ معتبر سے نکل

سمجھ اسے، جو تقاضا مرے سفر کا ہے
ذرا کبھی کبھی اپنی حدِ سفر سے نکل

عجیب ذائقہ ہے دھوپ میں جھلسنے کا
تو کس گمان میں ہے، خیمۂ شجر سے نکل

نہ راس آئے گی یہ بام و در کی قید تجھے
تو ساتھ بے کے بیاباں کو اپنے گھر سے نکل

یہ گردِ راہ نہیں کچھ طلسم موج سے کم
سنبھل کے حلقۂ گرداب رہ گزر سے نکل

عزیز تر ہے مجھے انفرادیت اپنی
تو اس کے سر کا ہے سودا تو میرے سر سے نکل

فضا افق بہ افق، تیرگی گھنی ہے بہت
تو آفتاب سہی وادیِ سحر سے نکل

بدنام ہوئی مفت ہوا، لے گئے آہو
شانوں پہ وہ خوشبو کی ردا، لے گئے آہو

گھر چھوڑ کے، اب دشت میں بھٹکیں گے مرے خواب
کیا چیز تھی، پلکوں میں چھپا لے گئے آہو

آوارگی اب ٹھہری، مرے پاؤں کی زنجیر
اس قید سے خود کو تو چھڑا لے گئے آہو

تا حدِ نظر، دھند میں لپٹا ہوا منظر
ہنستی ہوئی سب دھوپ چرا لے گئے آہو

ویران دریچوں کی طرح رہ گئے ہم سب
سب رنگ شفق، رنگِ حنا، لے گئے آہو

اب جا کے ترے گاؤں میں برسیں گے یہ بادل
آتے ہوئے موسم کی گھٹا لے گئے آہو

دیکھا، تو خود اپنا ہی بدن خون میں تر تھا
میں خوش تھا، کہ زخموں کی قبا لے گئے آہو

تھی شہر میں رسوا، ترے صحرا کی یہ تہذیب
اچھا ہے، مجھے ساتھ لگا لے گئے آہو

موجِ دمِ آہو، ہے سرابوں کا تماشا
دریا کو بھی صحرا میں بہا لے گئے آہو

ہونٹوں کی جگہ، جیسے کہ چہرے پہ ہو آنکھیں
ساری ہوسِ حرف و صدا، لے گئے آہو

سرمایہ معانی کا ہے الفاظ کی میراث
میں نافۂ آہو تھا، اٹھا لے گئے آہو

یوں سہل نہ تھا حجرۂ دانش سے نکلنا
دیکھی مری وحشت، تو بلا لے گئے آہو

پھرتے ہیں مہاجر کی طرح شہر میں تیرے
ہم لوگ ہیں رمنوں سے نکالے گئے آہو

بس، مشک قلم کے ہیں نگہدار فضاؔ ہم
کیا اس سے ہمیں واسطہ، کیا لے گئے آہو

فضا ابن فیضی

ایک نظم

دوسرا رُخ

زمینِ حسنِ طراوٹ سے ہو گئی محروم
شدید دھوپ میں جلتی رہی ہے
سینے پر
ہزار زخم سہی
وہ کبھی کبھی گویا
حسین خُلد سی مجھ کو دکھائی دیتی ہے
کھلا ہوا ہے جہاں کا ہر ایک دروازہ
نشانِ بابِ قفس ہے نہ کوئی زندانی
چلو زمین کے زخموں کا اندمال کریں
ہمارے عہد کو بیدار و لازوال کریں

حمید الماس

دو غزلیں

خورشید سحرؔ

خاموش ندیاں ہیں سمندر اداس ہے
وہ کیا گیا کہ گاؤں کا منظر اداس ہے
خود اپنے سر کو اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا
یہ سوچ کر کہ وقت کا خنجر اُداس ہے
فرصت ملے تو اس کی طرف دیکھیے کبھی
سرسبز پیڑ پر جو کبوتر اداس ہے
شادابیاں تھیں جتنی وہ اب ختم ہو چکیں
خوش رنگ موسموں کا کلنڈر اداس ہے
اس کی شبیہ آج بھی شاداب ہے مگر
کچھ دن سے وہ خلوص کا پیکر اداس ہے
موسم کا قہر ہے کہ یہ قدرت کا ہے مذاق
کانٹے چہک رہے ہیں گلِ تر اداس ہے
ہر لفظ اس کے دل کی کہانی تھا اے سحرؔ
وہ کہہ رہا تھا مجھ سے میرا گھر اداس ہے

بھولی بسری سی اک کہانی لکھ
پاسبانوں کی پاسبانی لکھ
آگ ہی آگ ہے یا پانی لکھ
کچھ تو احوالِ زندگانی لکھ
شہر کیسا ہے لوگ کیسے ہیں
کیا ہوا قہرِ آسمانی لکھ
میں سمیٹوں گا عمر بھر تجھ کو
تو مجھے دیگا کیا نشانی لکھ
چہرہ چہرہ جدا جدا ہے یہاں
تو کسی کو نہ اپنا ثانی لکھ
کیوں اُداسی ہے پیڑ پودوں پہ
سبز موسم کی بدگمانی لکھ
آ حصارِ انا سے باہر آ
لامکاں ہے تو لامکانی لکھ
پیاس قطروں سے بجھ نہیں سکتی
لب بہ لب موج بیکرانی لکھ
سلسلہ ختم کر عتابوں کا
کچھ تو لمحاتِ شادمانی لکھ

کلی کے رنگ میں عکس گلاب دیکھ لوں
ترے سوال میں پنہاں جواب دیکھ لوں
توقعات کی پرپیچ و خم راہوں میں
کسی کی آہٹیں سن لوں کہ خواب دیکھ لوں
محبتوں میں پنہاں نفرتیں بھی ہوتی ہیں
قریب جا کے سراب دیکھ تو لوں
نہ کوئی حرف لکھوں روشنی کی چاہت میں
کہ اپنے ہاتھ کی کالی کتاب دیکھ تو لوں
ہماری راہ میں کوئی آ رہا ہے نیاز
لرزتے کیوں ہیں لب بے تاب دیکھ تو لوں

بکھرے نہ کوئی روح کے داغوں کا سلسلہ
ٹوٹے نہ اے بہار ایاغوں کا سلسلہ
رخسار ہے تو نظر مجسم ہو
بجھنے نہ پائے جلتے چراغوں کا سلسلہ
دیکھو کہ ہاتھ ہاتھ ہے لوح حساب درد
بکھرا ہوا ہے آج دماغوں کا سلسلہ
ہم جی رہے ہیں غم کے اجالوں میں اے نیاز
حد نگاہ تک ہے چراغوں کا سلسلہ

غزلیں

محفل میں میرا ہونا یقین تھا گماں نہ تھا
لیکن میں آج رات جہاں تھا وہاں نہ تھا
سوچا تو ایک شخص نظر آیا گھات میں
دیکھا تو کوئی اس کے مرے درمیاں نہ تھا
پوچھو نہ زندگی کا سفر کیسے طے کیا
سورج تھا تیز اور کوئی سائباں نہ تھا
ہر اک ہوا میں ٹوٹ کے گر جائے اے خدا
ایسا تو خستہ حال میرا بادباں نہ تھا
یوں تو نیاز اس سے بڑی رسم و راہ تھی
مجھ سے بچھڑ کے روئے گا اس کا گماں نہ تھا

دے گئی رسوائیاں داد ہنر کی آرزو
غرق دریا کر گئی ہم کو گہر کی آرزو
ہے عبث خوابوں کا بونا آنسوؤں سے سینچنا
اس کی بنجر زمیں سے کیا شجر کی آرزو
راہبر ہو راہزن ہو ہمسفر ہو کچھ تو ہو
اے خدا کیسے کرے کوئی سفر کی آرزو
بدنصیبی ہائے! اس معمار کی مت پوچھئے
چل بسا دنیا سے لے کر دل میں گھر کی آرزو
کل کی پروازوں کا ہوگا زعم اس کو اے نیاز
آج تک جو کر رہا ہے بال و پر کی آرزو

نیاز اعظمی

غزلیں

بکھر گیا ہوں کہ تحلیل ہو گیا ہوں میں
مرے وجود کی تذلیل ہو گیا ہوں میں

سمیٹتا تھا ہر ایک ہاتھ میرے ذرّوں کو
یہ حسنِ ظن تھا کہ تشکیل ہو گیا ہوں میں

جو شکل دیکھی تو حیرت کی انتہا نہ رہی
یہ کیا کہ اتنا بھی تبدیل ہو گیا ہوں میں

میں اپنے گھر میں غریب الدیار لگتا ہوں
حدیثِ پاک کی تمثیل ہو گیا ہوں میں

ہر ایک آیتِ محکم کو کر دیا مبہم!
ہر اشتباہ کی تاویل ہو گیا ہوں میں

کبھی تھا حاصلِ جہد و عمل مگر آخر
مقامِ صبر کی تفصیل ہو گیا ہوں میں

وہاب تسنیم

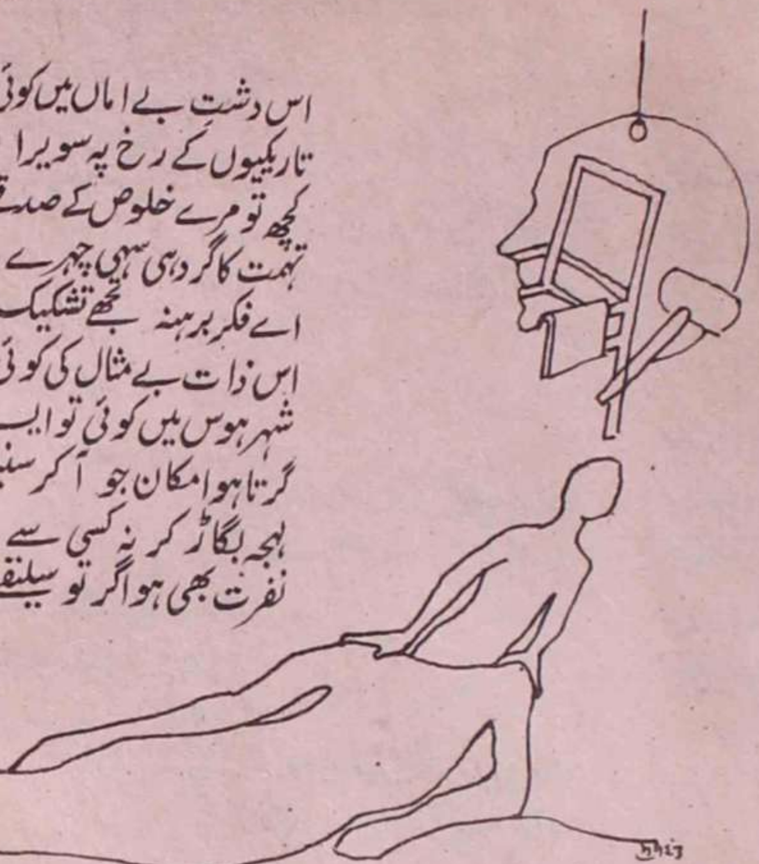

فاروق صدیقی

اس دشتِ بے اماں میں کوئی تو کمال دے
تاریکیوں کے رخ پہ سویرا اچھال دے

کچھ تو مرے خلوص کے صدقے نکال دے
تہمت کا گرد ہی سہی چہرے پہ ڈال دے

اے فکرِ برہنہ تجھے تشکیک ہے اگر
اس ذاتِ بے مثال کی کوئی مثال دے

شہرِ ہوس میں کوئی تو ایسا نہیں ملا
گرتا ہوا مکان جو آ کر سنبھال دے

لہجہ بگاڑ کر نہ کسی سے کلام کر
نفرت بھی ہو اگر تو سلیقے سے ٹال دے

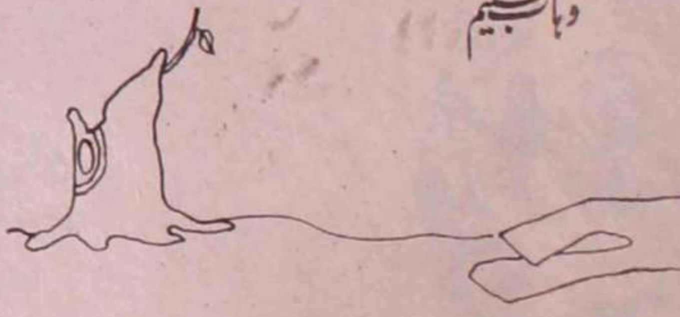

فنا ہوتے ہوئے دیوار و در کی
بڑی مدت پہ یاد آئی ہے گھر کی

بنا لینا گھروندے علم و فن کے
ابھی تو خاک چھانو در بدر کی

خدا روپوش ہوتا جا رہا ہے
کہ آنکھیں کھل رہی ہیں اب بشر کی

وہاں پہ عظمتوں کے در کھلے تھے
مگر رسوائی ہونی تھی ہنر کی

ہزاروں کارواں بھٹکے بظاہر
حقیقت کھل نہ پائی رہ گزر کی

رواں ہوتا گیا اپنے جنوں میں
ہوا جس کو نظر آئی جدھر کی

ہم اپنی منزلوں سے آشنا ہیں
ضرورت کیا ہے، ہم کو راہبر کی

دیویندر گوتم

(ایک نظم) ترش و تلخ

ضیا جبلپوری

جب کوئی ڈوبنے لگتا ہے تو وقت
موجِ طوفاں کا ثنا خواں بنکر
بحرِ الفاظ سے لاتا ہے اٹھا کر موتی
اور لکھتا ہے، قصیدے لاکھوں
وقت پروردہ لیلائے سیہ پوش بھی
ڈوبتے تاروں کا لکھ دیتا ہے
صفحہ تاریخ پہ نام
اور جھک جھک کے کیا کرتا ہے
چڑھتے سورج کو سلام

فریاد کی لے

ڈاکٹر یعقوب عامر

کبھی مقدور یہ تو ہو کہ ہم کچھ آرزو کر لیں
ملے اتنی تو آزادی کہ ہم کچھ جستجو کر لیں
کسی دن تو ہم اپنے چاک دامن کو رفو کر لیں

کہاں تک زندگی میں دوسروں کے گیت گائیں گے
خدایا اس زمیں پر کیا ہمارے دن بھی آئیں گے

ہماری مفلسی دُنیا کو مالا مال کرتی ہے
ہماری دردمندی ہم کو خستہ حال کرتی ہے
غضب یہ ہے مشقت بھی ہمیں پامال کرتی ہے

جو ملتی ہے متاعِ دل تو کوئی چھین لیتا ہے
نظر آتا ہے جب حاصل تو کوئی چھین لیتا ہے

ہماری ہڈیوں سے قمقمے روشن ہیں شہروں میں
ہماری تشنگی سے بہہ رہا ہے پانی نہروں میں
ہمارا پیچ و تابِ دل ہے دریاؤں کی لہروں میں

ہمارے غم سے خوشیوں کی جہاں میں ہے فراوانی
ہے آزادی زمانے کی، ہمارا طوقِ زندانی

جو ہم کو توڑتے ہیں اُن بتوں کو ہم بناتے ہیں
ہمیں تو زہر لے کر، شیر ناگوں کو پلاتے ہیں
ہم اپنے قتل کے فرمان پر خود سر ہلاتے ہیں

سیاست بانٹ دیتی ہے ہمیں فرقوں میں ذاتوں میں
ہمارا دن نکلتا ہے وہی تاریک راتوں میں

ہمارے سرد خانوں میں کبھی سورج نہیں آتا
کوئی رستہ ہمارے ساتھ آگے تک نہیں جاتا
ہے کتنی دُور منزل یہ خبر کوئی نہیں لاتا

ہمارا راہبر ہم سے بچھڑ جاتا ہے رستے میں
کہ ہم سے اُس کی منزل اس کو مِل جاتی ہے سستے میں

بھروسہ کر چکے ہیں ہم اگرچہ ہر جماعت پر
مگر تقریر ہوتی ہے ہماری ہی حماقت پر
ہیں داؤ پیچ سارے ختم اربابِ سیاست پر

اُبھرتا ہے جو ہم سے ہم کو ہی الزام دیتا ہے
ہمیں محرومیاں ملتی ہیں وہ انعام لیتا ہے

اگر فریاد کا نعرہ ہمارے لب پہ آتا ہے
اچانک ہم کو سرحد کی خبر کوئی سناتا ہے
الیکشن دھرم کا دروازہ آ کر کھٹکھٹاتا ہے

غرض وہ جال بُن جاتے ہیں اربابِ ہنر آ کر
کہ رہ جاتی ہے حسرت پیچ و تاب بے بسی کھا کر

سیاست کی دُکانوں پر غریبی کی نمائش ہے
کسے ملتی ہے منزل اور کس کی آزمائش ہے
کہاں بستی غریبوں کی کہاں اُن کی رہائش ہے

ملمع بھی سیاست کا مگر کیسا چمکتا ہے
زباں پر ایسے وعدے ہیں کہ ہر چہرہ دمکتا ہے

چڑھایا جائے گا قربان گاہوں پر ہمیں کب تک
چلایا جائے گا پُرخار راہوں پر ہمیں کب تک
گرایا جائے گا عزت پناہوں پر ہمیں کب تک

نظر کوڑے پہ بھی اک دن سبھی کی پڑنے لگتی ہے
خس و خاشاک سڑنے سے گلی بھی سڑنے لگتی ہے

ہماری لاش سڑنے سے تعفن پھیل جائے گا
ہوا بدبو کو ڈھوئے گی مرض قبضہ جمائے گا
بھیانک زندگی ہو گی، مدد کو کون آئے گا

ہمیں زندہ کرو گے کس طرح جھوٹے خدا تم ہو
تمھیں معلوم تب ہو گا کہ کیا کچھ ہم تھے کیا تم ہو

فتح

مختار شمیم

رعونت،
آمریت کے پرندے
بہت اونچے اڑے
.... اونچے اڑے ہیں
مگر
اب ان کے بازو تھک گئے ہیں!

....

نگاہ جابرانہ قہر برسانے کو اٹھی۔
ہزاروں خرمنوں کو خاک کرنے
— بہت ہی تیز تیکھا وار کرنے ٹوٹتی ہے....
.... مگر
خود اپنے خوں میں ڈوبتی ہے!

بڑے انداز سے جب نخوتوں نے بیج بوئے —
تو یہ زہریلی فصلیں لہلہائیں
حسد کی دھوپ میں پکتی رہی ہیں۔
مگر —
اب آگ میں خود جل رہی ہیں!

رعونت آمریت کے پرندے آسمانی
نگاہ جابرانہ، حاکمانہ، ظلم آسا، برق ساماں
غرور و نخوت و پندار کی یہ کم ردی فصلیں
میرے معصوم و سادہ دل پہ حیراں
میری آسودگی ذہن سے جیسے ہراساں!!

سانپوں کا شہر

چاروں جانب
دیکھ کے چلنا
راہ بہت دشوار ہے آج
انسانوں کی
آنکھیں
باتیں
کان
ناک
اور
ہاتھ
پیار
محبت
علم و ادب
تہذیب و تمدن
سچائی
افعی کی پھنکار کا نام
ان شہروں میں
ہم بستے ہیں
فن شہروں میں
پھسلتے ہیں
چاروں جانب
سانپ ہی سانپ؟

امیرِ عارفی

بیروت میں

عقیدہ
شخصیت
احساسِ خودداری
یہ کل تک آدمیت کے لوازم تھے
مگر اس
جگمگاتے، جاگتے دورِ تمدن میں
عقیدہ — آگ
شخصیت — ہیولا
اور
احساسِ خودی
خود اپنے شعلہ کا جہنم ہے!

امیرِ عارفی

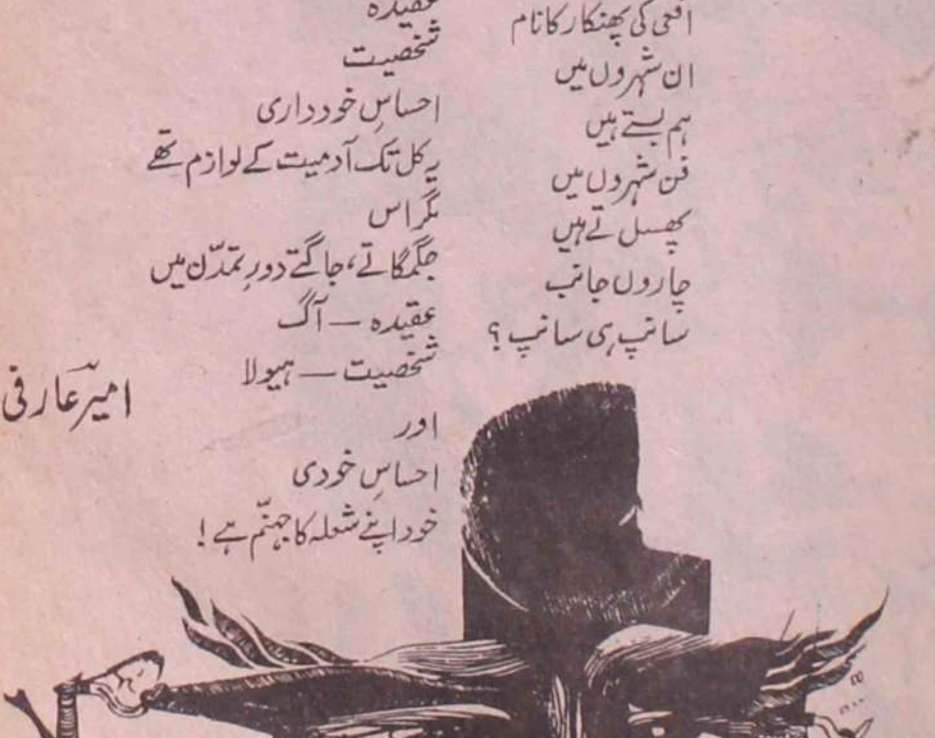

میرا گھر

ساتھ رہتے ہیں۔ مگر
مل جل کے رہ نہیں سکتے
یہ فضا ہے میرے گھر کی
کچھ اسی سے ملتا جلتا ہے محلے کا بھی نقشہ
شہر میں تو اور بھی ہے نفسا نفسی
ملک کا
جو حال ہے ظاہر ہے سب پر
جس قدر آباد حصے ہیں زمیں کے
سب کی حالت
ایک سی ہے
مختلف ہیں لوگ لیکن ایک جیسی ہے سرشت
ہر جگہ مٹی کی فطرت ایک ہے
تاثیر ایک
اس کا جب احساس ہوتا ہے
تو
میں یہ سوچتا ہوں
ساری دنیا میرا گھر ہے . . . .

تشویش

ابھی
تو قدموں میں راستہ ہے
ابھی
بہت مجھ میں حوصلہ ہے
یقین ـــــ
پھر کیوں گماں میں تبدیل ہو رہا ہے
بھروسہ
کیوں اپنی ذات پر بھی
نہیں ہے مجھکو
وجود سے
اعتبار اٹھنے کا کیا سبب ہے
ادھر . . . .
یہ کیوں سوچنے لگا ہوں
جواب دے جا گی
مری قوتِ ارادی

ڈاکٹر اختر نظمی

قصّہ جدید و قدیم

وہاب تسنیم

اردو جدید شاعری، پر سیمینار سے کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ قصہ قدیم و جدید کو چھیڑ کر دلیل کم نظری پیش کی گئی ہے۔ ہر دم متغیر حالات کے پیش نظر، خوب سے خوب تر کی تلاش ہیں، ہمارے فنکاروں نے خوب و ناخوب کے جو تجربے کئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنا مقصود ہے اور میرے پیش نظر اس وقت ان تجربوں کے صرف ایک پہلو کو اجاگر کرنا ہے اور وہ بھی میرے اپنے نقطۂ نظر سے

ہر فنکار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے فن میں درجۂ کمال حاصل کرے ادیب یا شاعر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ان کے یہاں کمال گویائی کا معیار سامنے رہتا ہے اس ضمن میں اقبال نے اپنے خاص انداز میں اس معیار کو اس طرح پیش کیا تھا

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائیست
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

حدیث خلوتیاں کی ترکیب میں جو گہرائی اور گیرائی ہے وہ کسی تعارف کی بھی محتاج نہیں اور رمز و ایما میں، جو اختصار، ایجاز اور لچک ہے وہ معلوم و مشہور ہی ہے۔ کلام میں لطف اور تاثیر کے ساتھ ترسیل کی تکمیل بھی کمالِ گویائی کا ایک جز ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو علائم سے اختصار میں جامعیت کا وہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے کہ قاری بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ ظالم نے کچھ نہ کہکر بھی بہت کچھ کہدیا۔

اردو شعر و ادب سے تھوڑا بہت شغف رکھنے والے بھی اس حقیقت سے ہرگز بے خبر نہیں ہو سکتے کہ فارسی، عربی اور ہندی کے ناتے اردو میں روز اوّل ہی سے علامت نگاری اپنا جادو جگاتی رہی ہے۔

بہت پہلے ولیؔ نے خوب تر کے لئے عصری افکار و نظریات سے استفادہ کا مشورہ دیا تھا

راہ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج بھی تازگی مضمون کی تلاش ہیں، فن کار امکان بھر اوپر سے گریز بھی نہیں کر رہے ہیں۔ خوابوں سے حقیقت نچوڑنے، اور لاشعور کی غیر مرئی لہروں کو کینوا س پر منعکس کرنے کی کوشش جاری ہے۔ اس تگ و دو میں فنکاروں کے لئے علامتیں ایک زبردست ہتھیار بن گئیں علامت نگاری ویسے بھی اردو شعر و ادب کے لئے کوئی نئی بات نہیں خاص طور پر غزل میں گل و بلبل، قفس و صیاد قاتل و بسمل جیسی بیسیوں علامتیں ہیں جو اپنا گہرا رنگ جمائے ہوئے ہیں۔

یہ رنگ کچھ اتنا گہرا چڑھا کہ بادہ وساغر کہے بغیر بات بنتی ہی نہ تھی۔ سر دلبراں بر حدیث دیگراں کا ؏ جادو چڑھا کر حدیثِ دلبراں کی روایت میں درایت کو شجر ممنوعہ قرار دیدیا گیا۔ اس رجحان کی وجہ سے علامت نگاری اردو شاعری میں زوال کی علامت بن گئی۔

مگر تازگی مضمون کے متلاشی، اس رجحان کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ اور انہیں ہونا بھی چاہیئے تھا۔ بغاوت کے بغیر کام بنتا نظر نہ آئے تو اور کیا کیا جائے۔ خضر کا سودا تو چھوٹا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی مگر ان اجنبی راہوں میں وہ لوگ ان کے خضر راہ بن گئے جو اردو کے مزاج اور منہاج سے ناواقف محض تھے۔ بودیر (BAUDELAIRE) اور ناغول (NARIVAL) ان کے آگے آگے چلنے لگے۔ ملارمے (MALLRME) سے یہ لوگ استفادہ کرنے لگے۔ فرائڈ اور ڈارون کے نظریات تو نظر میں تھے ہی۔ اب نفسیاتی تجربے اور لاشعور کے کرشمے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگے۔

انگریزی کے جدید شعری امام ہیوم (HUME) نے سمجھایا کہ شاعری تازہ علائم، عصری استعارے چاہتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ نئے ہیں بلکہ اس لئے کہ پرانے علائم اور استعارے اپنے مقصد میں ناکام ہو چکے ہیں۔ یعنے نئی علامت نگاری یا سمبالزم کا شوق اردو ادب میں ایک رجحان کی صورت اختیار کرنے لگا۔

"علامتوں کے بارے میں تسلیم شدہ حقیقت یہ ہے کہ علامتیں معنی کی یافت اور یاد دہانی کا ذریعہ ہیں۔ اگر ایک مرتبہ یہ علامتیں پہچان لی گئیں تو ان کے معنی کبھی ختم نہیں ہوتے" مگر نئی علامت نگاری میں تسلیم شدہ یہ حقیقت" ایک خواب بن گئی۔ اور خواب کی باتیں حقیقت سمجھی جانے لگیں۔ علائم کی دنیا میں ایک انارکی پیدا ہو گئی جناب عمیق حنفی کی ایک نظم ہے پتھر۔ اس کے تقریباً ہر شعر میں پتھر کی علامت موجود ہے۔ مگر ہر جگہ پتھر کچھ اس طرح بٹھایا گیا ہے کہ قاری معنی کی یافت کے لئے بجنگ آمدہ پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی نہج پر سورج، شام، تنہائی، سمندر، صحرا، جنگل۔ دہلیز۔ کھڑکی۔ مرغا، جیسے علائم کو بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔

والیِن نے "فن شاعری (ARTPOETIQUE) میں یہ بات پیش کی کہ۔ الفاظ اصلی چیز ہیں۔ شاعر کو اپنا مافی الضمیر کبھی صاف اور واضح بیان نہیں کرنا چاہیئے بلکہ شاعری کو مبہم اور غیر واضح ہونا چاہیئے شاعر کے بیانات جتنے دھندلے ہوں گے

اتنا ہی اشعار میں لطف ملے گا۔

اور تاریخ اپنے آپ کو دہرانے لگی۔

غالب نے کبھی اپنی فنی "شخصیت" کا اظہار اس طرح کیا تھا

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

تو نئی سمبالزم میں ظفر اقبال نے اپنی فنی "شخصیت" کو اس طرح پیش کیا تھا

آ مشکل پیرولی، انجاں، ایجاد
مگن میٹھد، عجب اشعار نے کا
پٹخ باٹی پرانی پنچو یشن
چیخ چندن، رسیدہ افکار نے کا
ظفرے انت بری باتاں بتنگڑ
بطن بے کار نے بے چار نے کا

وہاں تو ایک صورت تھی یہاں اللہ ہی اللہ ہے

اسی کارواں کے ایک شاعر نے لاشعور سے شعور کی بات کہدی، سلیم احمد کہتے ہیں

سر منڈاتے ہیں ہم سے آکے خیالی
اپنا پیشہ ہوا ہے حجالی

ظفر اقبال کو پڑھنے کے بعد سلیم احمد کے اس اعتراف سے انکار کی جرأت کس کو ہو سکتی ہے۔

تقلید کی روش سے دامن بچا کر چلنے والے خود ہی مقلد بن گئے۔ اور بعض تو اتنے اندھے مقلد بن گئے کہ انہوں نے خودکشی ہی کو نجات کا راستہ سمجھ لیا۔ اندرے بریتون نے انہیں بتایا۔ "حقیقت، سوسائٹی اور انسان بالکل جاہل، لاعلم اور ناقابلِ برداشت ہیں ہمیں اپنے ہاتھ میں پستول لے کر نکلنا چاہیئے تاکہ خودکشی کی منزل سے بے نیل و مرام واپس نہ ہونا پڑے۔"

ہر چیز کا انکار اس رجحان کا مقصد وحید بن گیا۔ "شعری مروجہ ہیئت سے انکار اسلوب۔ اور طرزِ فکر سے انکار۔ روایتی علامتوں سے انکار مقصدیت سے انکار ____" مختصر یہ کہ نئی علامت نگاری کے علم بردار سماجی رشتوں کے منکر ہو گئے جواباً سماج نے بھی ان سے انکار کر دیا۔

جدیدیت کے اس "انکار" کا رشتہ لاشعوری طور پر دادا ازم سے جا ملا۔ خود اندرے بریتوں دادا ازم کا مشہور پیرو کار تھا۔ بعد میں اس سے نظریاتی اختلافات کی بنا پر اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور باقاعدہ طور پر سرریلزم کی بنا ڈالی جس میں بقول سید محمد عقیل دادا ازم کے غیر استدلالی طرزِ فکر اور تحت الشعور کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اندرے بریتوں کا خیال ہے کہ سرریلزم خالص نفسیاتی آٹومیٹزم ہے جس کا مدعا زبانی تحریری یا دوسرے ذرائع سے فکر کے حقیقی عمل کو پیش کرنا سرریلزم کا نصب العین ہے۔

اردو شاعری پر سرریلزم کا راست اثر اتنا نمایاں یا منفرد نہیں مگر سمبالزم کے تحت نفسیاتی آٹومیٹزم کا اظہار ملتا ہے سرریلسٹ نقطہ نظر سے فنی تخلیق کا سرچشمہ لاشعور ہے۔ خودرو خیالات، اور آزاد تخیل کی عکاسی نے اس رجحان کو ارضیت آشنا نہیں رکھا۔

میراجی اس جدیدیت کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں۔ مگر ان کی شاعری کے متعلق ان کے ایک نبض شناس شاعر اور نقاد وزیر آغا کہتے ہیں کہ میراجی رو بہ زوال سورج ہے جو دھرتی کی طرف ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں اندھیرا، رات، بھوت، وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔

اس سلسلے میں اینٹی غزل پر بھی تجربے کئے گئے۔

مکھی کی دُم کی سوچ میں جھومتا رہا
مکھی اگرچہ ہاتھ ہلاتی رہی تو کیا
چیل نے انڈا چھوڑ دیا
سورج آن گرا چھت پر
سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہو گئی
پڑوسی کے چھت پر جو بندر گرا
دھڑا دھڑ بڑی نیند کا گھر گرا

محمد علوی اگرچہ جدیدیت کے پیرو کار ہیں مگر جدید شاعری کے مزاج کو وہ سمجھ چکے ہیں کہتے ہیں

کیوں سر کھپا رہے ہو مضامین کی کھوج میں
کر لو جدید شاعری لفظوں کو جوڑ کے

اردو شاعری کو یورپ کے جن رنگوں سے رنگین بنانے یا بگاڑنے کی جو لاشعوری کوشش کی گئی اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کمار پاشی نے کہا تھا۔

رنگوں کے اہتمام میں صورت بگڑ گئی
لفظوں کے دھن میں ہاتھ سے معنی نکل گئے

••

• چنگاری اب نہ صرف یہ کہ باقاعدہ شائع ہو رہا ہے بلکہ باقاعدگی سے پوسٹ بھی کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو کوئی شمارہ نہیں ملا تو ہمیں ایک پوسٹ کارڈ لکھ دیجئے۔ اطلاع ملتے ہی رسالہ ارسال کر دیا جائے گا۔

• اگر آپ نے کوئی کتاب چھاپی ہے تو اس کی تفصیلات ارسال کر دیجئے ہم تازہ مطبوعات میں شائع کر دیں گے۔ (اس کے لئے کتاب بھیجنا ضروری نہیں۔ لیکن اگر آپ تبصرہ چاہتے ہیں تو دو کاپیاں بھیجیے۔

• اگر آپ کے پاس اشاعت کے لئے کوئی مسودہ ہے تو اس کی بھی تفصیلات لکھئے۔ ممکن ہے ہم آپ سے تعاون کر سکیں

• چنگاری میں ہم تمام کلچرل سرگرمیوں کی رپورٹ شائع کریں گے۔

اور ایک سب سے اہم بات

چنگاری کے پانچ خریدار بنانے والوں کو چنگاری کے بارہ شمارے مفت بھیجے جائیں گے۔

چنگاری ۱۴۱۰/۳ رام نگر شاہدرہ دہلی

یہ کالم نگاری نمبر میں نے مرتب کیا ہے۔ اِس میں جتنا حُسن ہے، قاری اس کا کریڈٹ مجھے عنایت فرمائیں۔ اور جتنی خرابیاں ہیں (کیونکہ اہل نظر خرابیاں ضرور نکالتے ہیں) تو اُن کے لیے میرے دو معاون مرتب بشیر احمد اور انیس احمد خان موجود ہیں۔ آپ اُن کی طرف رجوع کیجیے، اُنہوں نے خدا کی قسم کھا کر وعدہ کیا ہے بُرا نہیں مانیں گے۔ (دونوں خدا کو نہیں مانتے)

میری یہ طبعی خصوصیت رہی ہے۔ کہ میں نے زندگی میں جس بھی رسالے کی ادارت فرمائی۔ وہ انشاءاللہ تعالیٰ بند ہو گیا (اللہ تعالیٰ کو موردِ الزام ٹھہرانے میں آسانی ہوتی ہے)، جس رسالے کو بند ہونا مقصود ہو۔ وہ میری خدمات حاصل کرنے کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہیں ـــــ بشیر احمد صاحب کا کیا مقصد تھا۔ کہ مجھے "چنگاری" کے کالم نگاری نمبر کی ادارت بخش دی۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اس خاص نمبر کے بعد "چنگاری" کا کیا حشر ہوگا؟ میں وہ بھی نہیں کہنا چاہتا۔ تاریخ میں اگر اپنے آپ کو دہرانے کی خصلت ہے۔ تو اُسے کوئی نہیں بدل سکتا۔ نہ اللہ تعالیٰ نہ بشیر احمد۔

میں نقاد نہیں ہوں۔ (اور شکر ہے کہ نہیں ہوں) ورنہ کالم نگاری کی روایات پر ایک عالمانہ مقالہ لکھ کر آپ کو مرعوب کر لیتا۔ مرعوبیت کچھ زیادہ اتھینٹک بنا دیتی ہے ـــــ اگرچہ اِسے اتھینٹک بنانا چاہتا۔ تو یورپ اور امریکہ کے چند مصنفین کے ارشادات کے حوالے ضرور شامل کرتا۔ ان میں چند مصنفین کے نام نامانوس ہوتے تو مقابلے کی دھاک زیادہ جم جاتی۔ بلکہ میں تو یہاں تک لکھ دیتا۔ کہ ولیم شیکسپیئر بھی پہلے کالم نگاری ہی کرتا تھا۔ بعد میں اُس نے اپنے کالم اس لیے تلف کر دیے۔ تاکہ اُس کے ڈراموں کو ادب عالیہ تسلیم کروانے کے مواقع فراہم ہو جائیں۔

اطلاعاً عرض ہے۔ کہ کالم نگاری کو ادب عالیہ نہیں مانا جاتا۔ بلکہ سرے سے ادب ہی نہیں مانا جاتا ـــــ

کالم نگاری کا ایک المیہ یہ ہے۔ کہ جرنلزم کے سربراہ اُسے صحیح جرنلزم شمار نہیں کرتے۔ اور ادبی سربراہ اُسے ادب کی ذیل میں نہیں آنے دیتے۔ یہ ایک عجیب مضحکہ خیز حقیقت ہے۔ کہ جن ادیبوں نے ادب عالیہ تخلیق کیا۔ اُنہیں تو مسلمہ فن کار تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن انہی مسلمہ فن کاروں نے کالم نگاری بھی فرمائی، اُسے اہلِ بینش (مجھے نقادوں کو ہی مجبوراً اہل بینش کہنا پڑتا ہے) ادب ماننے سے کتراتے رہے۔

کیوں کتراتے رہے ؟ شاید اسے سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، رتن ناتھ سرشار، کنہیالال کپور، قاضی عبدالغفار؛ حتیٰ کہ فکر تونسوی تک بھی نہ سمجھ سکیں۔ چارلس ڈکنس (میں نقادوں کی طرح شرفائیں ہوتا۔ تو ڈکنس ایسے یورپین مصنف کا حوالہ دینے سے گریز کرتا) کو ہم عالمگیر ادبی مرتبہ دیتے ہیں۔ مگر یہ مانتے ہوئے نجانے کیوں شرماتے ہیں کہ وہ کالم نگاری کرتا تھا۔ اور اس کا کالم پڑھنے کے لیے ہزار ہا قاری یوں منتظر رہتے تھے۔ جیسے کوئی حسین محبوبہ کی آمد پر ہر عاشق اپنی اوور ہالنگ کا منتظر رہتا ہے۔

ڈکنس کو مقبولیت عامہ عنایت کرنے میں اُس کی کالم نگاری کا بڑا رول ہے۔ (میرا ذاتی وہم) اُردو زبان (چاہے آج وہ تاریخ کی غیر مدلل ستمگری سے فقط سرکاری خیرات کا ایک صلہ بن کر رہ گئی ہو) کی اعلیٰ روایات میں ایک منفرد روایت کالم نگاری کی بھی رہی ہے۔ اور جب میں اس منفرد روایت کے ماضی اور حال پر نظر دوڑاتا ہوں، مستقبل پر نظر اس لیے نہیں دوڑاتا۔ کہ مستقبل نے تو بڑی بڑی تہذیبوں کو فنا کر ڈالا ہے، تو مجھے یوں لگتا ہے۔ کہ اُردو کالم نگاری کی روایت ہماری گذشتہ ایک صدی تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ روایت اس لیے طویل ہے۔ کیونکہ اُردو کالم نگار ہمارے معاشرے کے روزمرہ دُکھ سُکھ، آنسوؤں اور مسکراہٹوں سے کما حقہ آگاہ رہتے تھے۔ اُن کی سوچ، نگاہ اور قلم، بے تابانہ مضطرب رہتی تھی۔ کہ آج سماج میں جو مضحکہ خیز واقعہ ہے: اسے ادبی قالب دینے سے پہلے پہلے ہی کالمی قالب میں ڈھال دیا جائے۔ کیونکہ قاری، کالم پڑھنے کے بعد وہ اطمینان قلب سے ناشتہ کر سکے۔ اگر وہ اُس واقعہ کے ادبی تخلیق بننے کا انتظار کرتا رہا۔ تو ناشتے سے محروم رہ جائے گا۔ کالم اور اُردو ادب کے درمیان تو کئی ناشتوں کے فاصلے ہیں۔

اور پھر اس اطمینان کے اندر ایک اور لہر بھی ہوتی ہے۔ کہ اعلیٰ ادیب کے نوشتۂ قلم میں ادب کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور روزانہ واقعہ قلمبند کرنے والے کی ایک نگاہ بھی ہوتی ہے۔ اُس نگاہ میں ادب کی کچھ فیصدی کارفرما نہیں ہوتی۔ تو وہ کالم اُس جھوٹے حلوائی کی دُکان پر لکھا ہوا سائن بورڈ ہوتا ہے جس پر تحریر ہوتا ہے "یہاں خالص دیسی گھی استعمال کیا جاتا ہے۔"

خالص دیسی اور خالص بناسپتی گھی میں صرف ایک چیز حائل ہوتی ہے۔ اور وہ ہوتی ہے: حلوائی کی توند۔ جو پیشہ ور گواہوں کی طرح اُس بورڈ کے ذریعے اپنا دھندا کیے جاتی ہے۔ اس کالم نگاری نمبر میں چند پیشہ ور گواہوں کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس میں ہماری نیت بُری نہیں تھی۔ سائن بورڈ بُرا تھا۔ اور مجھے تو وہ خوشخط سائن بورڈ بھی اور زیادہ بُرا لگتا ہے۔ جس کے متعلق مجھے معلوم ہو۔ کہ خود بیچارے پینٹر کو بھی اس کی ادائیگی نہیں کی گئی۔

بہر کیف میں اس بحث میں پڑ کر اپنے آپ کو خواہ مخواہ مضمحل نہیں کرنا چاہتا۔ کہ کالم نگاری کی حدود کہاں

ختم ہوتی ہیں اور ادب عالیہ کی حدود کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ حدود کے جھنجھٹ میں پڑنے کا اضمحلال نقادانِ کرام کا شغل ہے بلکہ لطف ہے۔ مگر میرے ذہن میں تو صرف قاری کا لطف ہے۔ اگر کسی قاری کو صبح ایک کالم پڑھتے ہوئے یہ معلوم ہو جائے۔ کہ آٹھ دس سال کے ایک لڑکے نے ایک فروٹ شاپ سے ایک کیلا چرالیا۔ تو شور مچ گیا۔

شور مچانے والوں میں سے ایک صاحب نے لڑکے کے منہ پر طمانچہ جڑ دیا۔ اور تہذیبی اخلاق کی بلند چوٹی پر کھڑے ہو کر لڑکے سے کہا۔ "حرامی پلّے! جانتے ہو، تم نے یہ کیا ذلیل حرکت کی ہے۔"

لڑکا بولا "جانتا ہوں، میں نے چوری کی ہے۔"

"کیوں کی ہے؟" —— ایک دوسرے طمانچے کے ساتھ

"میں بھوکا تھا۔ لہٰذا میں نے چوری نہیں کی، شکم پروری کی ہے۔"

اور پھر سب کے گھونسے، لاتیں، گالیاں اور یہ خطرہ کہ آہ! ہمارا سماج اتنا گر گیا ہے۔ کہ شکم پروری اور چوری میں گناہ ہی نہیں سمجھتا۔ قانون! قانون! کہاں ہے قانون؟ اے جی ڈیوٹی کانسٹیبل صاحب! اس لڑکے کو تھانے لے جائیے۔

اور جب ڈیوٹی کانسٹیبل اُسے تھانے لے جا رہا تھا۔ تو قریب کے چوک پر ہزاروں کے مجمع کے سامنے ایک لیڈر تقریر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "بھائیو! میں بھوکے ننگے عوام کے لیے ہی یہ الیکشن لڑ رہا ہوں۔ کامیاب ہوتے ہی اگر یہ بھوک ختم نہ کر سکا۔ تو آپ بے شک مجھے پھانسی پر چڑھا دیجیے"۔

ہاں، قاری جب اس ہنگامی واقعہ کا مطالعہ صبح کے کالم میں پڑھے گا۔ تو تعجب، تاسف اور تکلیف کے ساتھ اُس کے سامنے اپنے معاشرے کے کردار اس کے تضاد، اُس کی مضحکہ خیزی اور سیاست دانوں کی پھانسی پر چڑھنے کی تمنا (آہ! جو تمنا کبھی پوری نہیں ہوتی) کی پوری تصویر سامنے آجائے گی۔ اور وہ اُس سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچے گا۔ کہ میں جس سماج میں سانس لے رہا ہوں۔ یہ سانس اس کی پھانس بنتے جا رہے ہیں۔ اور ایسے سماج میں اگر کوئی تغیر نہ لایا گیا۔ تو ہم تمام شہری، شہری نہیں کہلائیں گے۔ جنگلی کہلائیں گے۔

اور کل یہ کالم نگار کس موضوع پہ کالم لکھے گا۔ مجھے بے چینی سے انتظار کرنا چاہیے۔ کیونکہ ایسے ہی کالم اس تغیر کے پیغمبر ہیں۔ جو شہر کو جنگل بننے سے روک سکتے۔

چنانچہ اُردو زبان میں ایک صدی سے لکھے جانے والے کالم یہ ثابت کرتے ہیں۔ کہ ہمارے کالم نگاروں نے جب بھی کالم کے لیے قلم اُٹھایا۔ گرد و پیش کی روزمرہ زندگی، سماجی اور سیاسی اور اقتصادی گمراہیاں اور

تضاد اُن کے قلم کی لپیٹ میں آگئے۔ اور اگرچہ وہ ادب عالیہ کا مقام نہ پا سکے۔ لیکن پھر بھی اُن کی نگاہ میں ایک خوشحال اور بہتر اور صحت مند سماج کا تصوّر متواتر جھلکیاں دکھاتا رہا ___ اُن کے نوشتے، ہنگامی ضرور تھے۔ مگر اپنی ایک مستقل حیثیت بھی رکھتے تھے۔ مجھے آج بھی مختلف قاری ایسے ملتے ہیں۔ جو مختلف کالم نگاروں کے مختلف کالموں کے حصے، اپنی یادوں کی کمین گاہوں سے نکال کر اس دلچسپی سے سُناتے ہیں۔ جیسے محفلِ خورد و نوش میں کوئی اعلیٰ شعر سُنا دیتا ہے۔

بلکہ ایک قاری نے تو مجھے یہاں تک بتایا۔ کہ ایک کالم نگار کا کالم جب صبح کو آتا۔ تو بیس پچیس آدمی میرے گھر آجاتے۔ چونکہ ہمارا ملک پسماندہ ہے اور وہ اَن پڑھ تھے۔ لیکن اُنہیں کالم سُننے کا اتنا چسکہ تھا۔ کہ میں وہ کالم پڑھ کر سُناتا جاتا اور وُہ واہ واہ کرتے جاتے۔ یوں لگتا تھا، میں کالم نہیں پڑھ رہا ہوں، رامائن کتھا کر رہا ہوں۔ پسماندگی بھی ہماری کالم نگاری کے لیے کتنی خوش آئند غنیمت ہے۔ اور مجھے تو وہ قاری کبھی نہیں بھولتا۔ جس نے اپنی بھینس کی گم شدگی کا اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ تو میں نے اُسی اخبار میں گم شدگی کے موضوع پر ایک کالم لکھ دیا تھا۔ اور اُس قاری نے چوتھے دن آکر بتایا۔ کہ اگرچہ اُس کالم میں میری بھینس کا مذاق اُڑایا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بھینس مجھے مل گئی تھی۔ اشتہار کی بدولت نہیں بلکہ اُس کالم کی بدولت۔

میں نہیں جانتا۔ کہ ہمارے اس کالم نگاری کی بدولت کتنی گم شدہ بھینسیں ملیں گی، کتنے سیاسی سماجی اور اقتصادی واقعات کے گم شدہ گوشے اُبھر کر سامنے آجائیں گے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کالموں کا یہ اجتماع؛ ہمارے برصغیر کی صد سالہ تاریخ کے وہ اوراق ہیں جنہیں صرف یہ کہہ کر آسانی سے نہیں پھاڑا جا سکتا کہ "ہُنھ! یہ تو فقط کالم ہیں، ادب تھوڑے ہیں۔"

فکر تونسوی

مارچ ۸۳ء

کالم نگار نمبر سے اقتباس

CHINGARI (Fortnightly) 1410/3 Ram Nagar Shahdara Delhi-32
R. N. 36930 80 Regd. No. D (E) 49 Price Rs.- 2- 00

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت

★ پندرہ روزہ چنگاری ایک ایسا رسالہ ہے جسے خاص و عام دونوں حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے۔ اس کے ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے اور زرِ سالانہ ۴۵ روپے ہے۔

★ راجندر سنگھ بیدی نمبر کی قیمت ۶۵ روپے ہے۔

★ سعادت حسن منٹو (ایک نفسیاتی تجزیہ) کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔

★ لوکاچ اور مارکسی تنقید مصنّفہ اصغر علی انجینیئر، کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔

چنگاری، منٹو، بیدی اور لوکاچ کی مجموعی قیمت ۱۷۰ روپے ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمیں ۱۲۰ روپے ارسال کردیں تو بیدی نمبر، منٹو اور لوکاچ آپ کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیج دیا جائے گا اور ایک سال کے لیے چنگاری آپ کے نام جاری کردیا جائے گا۔

اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ

★ اگر آپ پندرہ روزہ چنگاری یا ماہنامہ عصری آگہی کے سالانہ خریدار ہیں تو آپ کو ہر کتاب کی خریداری پر پندرہ سے بیس فیصد کمیشن دیا جائے گا چاہے آپ ہمارے ادارے کی کتاب خریدیں یا ہمارے توسط سے کسی دوسرے ادارے کی کتاب۔

پتہ:-

عصری آگہی پبلی کیشنز، ۱۴۱۰/۳ - رام نگر، شاہدرہ دہلی ۳۲